غالب
کالی داس گپتا رضاؔ
(مختصر حالات اور انتخابِ کلام مع شرح)

غالب

(مختصر حالات اور انتخابِ کلام مع شرح)

کالی داس گپتا رضاؔ

نام کتاب: غالب۔ مختصر حالات
اور انتخابِ کلام مع شرح

مرتب، مؤلف
اور شارح: کالی داس گپتا رضا

سالِ اشاعت: ۱۹۹۸ء

ناشر: ساکار پبلشرز پرائیویٹ لمیٹڈ
۱۰۷ جولی بھون نمبر ۱
۱۰ نیومرین لائن۔ ممبئی ۴۰۰۰۳۶

تعداد: پانچ سو

قیمت: ساٹھ روپے

پرنٹر: موج پرنٹنگ بیورو۔ گرگام ممبئی
بذریعہ وی آئی پی انٹرپرائزز
واشی نیوممبئی ۴۰۰۷۰۳

فہرست

حرفے چند

مَیں نے یہ کتاب پونے کے چند دوستوں کی فرمایش پر لکھی تھی۔ اُن کی خواہش تھی کہ مَیں ایک ایسی کتاب غالبؔ سے متعلق لکھوں جس میں غالبؔ کی زندگی کے حالات بھی آجائیں اور غالبؔ کے لگ بھگ دو ڈھائی سو اردو اشعار کا انتخاب بھی شامل ہو نیز ان اشعار کے معنی بھی سلیس زبان میں بیان کر دیے جائیں تاکہ پڑھنے والوں کے لیے آسانی ہو۔ اس فرمایش سے مراد یہ بھی تھی کہ ان اشعار کی شرح کو مراٹھی میں ترجمہ کرکے شائع کیا جائے۔ چنانچہ یہ مختصر کتاب اسی شدید خواہش کا نتیجہ ہے۔

آج تک غالبؔ اور غالبیات پر میری ۱۸ کتابیں چھپ چکی ہیں اس لیے مجھے غالبؔ کی زندگی کے حالات لکھنے میں کوئی دِقّت نہیں ہوئی مگر انتخابِ کلام کے ۲۷۵ دو سو پچھتر اشعار کے معانی بیان کرنے میں ضرور وقت لگا۔ مَیں نے پہلے خود اشعار کے معنی لکھے پھر بعض دوسری شرحوں سے مقابلہ کرکے اپنے معانی کی تصدیق کی۔ یہ معانی اس علمی ادبی زبان میں نہیں جو عموماً غالبؔ کے اشعار کی شرح کے لیے استعمال کی جاتی ہے بلکہ زبان کو ایک حد تک دانستہ سادہ اور سلیس رکھا گیا ہے۔ کیا مَیں اپنی ذمّہ داری کو ٹھیک ڈھنگ سے نباہ سکا ہوں؟ اس سوال کا جواب صرف آپ کے پاس ہے۔

۲۷ دسمبر ۱۹۹۸ء

کالی داس گپتا رضاؔ

فہرستِ اشعار

(قافیہ و ردیف کی شناخت کے پیشِ نظر صرف مصرعِ ثانی ہی درج کیا گیا ہے)

غالب

مختصر حالات

مرزا محمد اسد اللہ بیگ خاں غالب اردو شاعری کی ناک سمجھے جاتے ہیں۔ مغلیہ سلطنت کا زوال اگرچہ عہدِ غالب سے بہت پہلے شروع ہو چکا تھا تاہم اتفاق ہی کہیے کہ وہ اس زمانے میں پیدا ہوئے جب سلطنت مغلیہ سانسیں گن رہی تھی۔ دہلی میں آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی حکومت کے چل چلاؤ کا زمانہ تھا۔ تعلیم، تمدن اور معاشرت کے لحاظ سے ملک پستی کی گہرائیوں میں گر چکا تھا۔ کون جانتا تھا کہ ان حالات اور اس ماحول میں ایک ایسا شاعر پیدا ہوگا جو نہ صرف اپنے پیش روؤں اور ہم عصروں میں برگزیدہ ہوگا بلکہ آنے والی نسلیں بھی اس کا نام عزت اور فخر کے ساتھ لیں گی اور اس کے کلام کو سر آنکھوں پر بٹھائیں گی۔

مرزا غالب ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا مرزا قوقان بیگ خاں، جن کی زبان ترکی تھی، غالب کی پیدائش سے چونتیس سال پہلے سمرقند چھوڑ کر ہندوستان آئے تھے۔ غالب کے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں لگ بھگ ۱۷۶۵ء میں دہلی میں پیدا ہوئے اور بڑے ہو کر مختلف ریاستوں، پہلے لکھنؤ میں پھر حیدرآباد، الور وغیرہ میں ملازم رہے۔

غالب پانچ برس کے تھے کہ ان کے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں ۱۸۰۲ء

میں، ریاست الور کی طرف سے کسی مقابلے میں مارے گئے اور غالب کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ خاں نے ان کی پرورش کا بار اپنے سر لیا۔ لیکن قدرت نے انہیں بھی اس کا زیادہ موقع نہ دیا اور چار پانچ برس بعد ۱۸۰۶ء میں وہ بھی اپنے بڑے بھائی سے جا ملے اور غالب کی، سرکار کی طرف سے، ساڑھے سات سو روپے سالانہ پنشن مقرر ہو گئی۔ چچا کی وفات کے بعد غالب اپنے نانا خواجہ غلام حسین کمیدان کے پاس آ گئے، جن کا خاندان آگرہ کے امیر گھرانوں میں سے تھا۔ مرزا کی پرورش بڑے ناز و نعم سے ہوئی۔ ہر ممکن عیش و آرام اور آزادی حاصل رہی۔ لیکن لاڈ پیار کے ساتھ اُن کے نانا نے تعلیم کا بھی خیال رکھا۔ غالب کو فارسی سے بہت دلچسپی تھی۔ اُن کے ایک استاد آگرہ کے مولوی محمد معظم کا پتا چلتا ہے جو انہیں فارسی بھی پڑھایا کرتے تھے۔ غالب نے بہت چھوٹی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ اندازہ ہے کہ پہلے اردو ہی میں شعر کہے ہوں گے کیونکہ گھر کی زبان اُردو تھی۔

۱۹ اگست ۱۸۱۰ء کو ان کی شادی دہلی میں نواب الٰہی بخش معروف کی بیٹی امراؤ بیگم سے ہو گئی۔ ان کا دہلی آنا جانا اس سے پہلے بھی رہتا تھا مگر اب وہ مستقل طور پر دہلی ہی میں رہنے لگے۔ اس وقت عمر یہی پندرہ سولہ برس کی ہو گی۔ سکونت کی یہ تبدیلی مرزا غالب کی زندگی کا ایک نہایت اہم واقعہ ہے۔ اگر وہ آگرے ہی میں رہتے تو شاید شاعری میں اس بلند مرتبہ کو نہ پہنچ سکتے کیونکہ دارالسلطنت میں پہنپنے کے مواقع زیادہ تھے۔

ابتدا میں غالب کا کلام بہت مشکل ہوتا تھا کیونکہ وہ مشہور فارسی شاعر بیدل کے رنگ میں شعر کہا کرتے تھے۔ اسی لیے ان کے اکثر عجیب و غریب اشعار سخن فہموں کی سمجھ میں نہ آتے تھے۔ تاہم دہلی کا ماحول ان کے لیے ادبی لحاظ سے بے حد خوشگوار ثابت ہوا۔ شعرا میں شاہ نصیر، ذوق، مومن، علماء میں شاہ عبدالعزیز، شاہ اسمٰعیل، شاہ عبدالقادر، حضرت سید احمد بریلوی، مولانا فضل حق خیر آبادی، طبیبوں میں حکیم محمود خاں، حکیم احسن اللہ خاں، حکیم رضا خاں اور صاحب نظر شاعروں میں نواب مصطفٰے خاں شیفتہ وغیرہ موجود تھے۔ خوش قسمتی سے مرزا غالب کو ان صاحبانِ علم و

فن کی دوستی اور قربت بھی حاصل ہو گئی۔ ظاہر ہے ان بزرگ ہم عصروں نے غالب کو ان کے اشعار کی خوبیوں اور نقائص سے آگاہ کیا ہو گا۔

دہلی آنے کے بعد غالب کی شاعری میں جو نمایاں تبدیلی پیدا ہوئی اس کی ایک اور وجہ بھی ہو سکتی ہے۔ یہاں آکر انہوں نے بغور ہندوستان اور ایران کے فارسی اساتذہ کا مطالعہ کیا اور اس کے بعد اپنا اسلوب پیدا کیا۔ غالب کی شہرت ایک اردو شاعر کی حیثیت سے ہے لیکن انہوں نے اُردو زبان میں شعر کہنے کے لیے بھی بیشتر بیدل اور اُس کے بعد شوکت، اسیر، عرفی اور نظیری تک سے مدد لی جو فارسی زبان کے شاعر ہیں۔ اُردو میں وہ میر کے مدّاح تھے۔ اپنے دیوان میں انہوں نے میر کا ذکر عزت اور ادب کے ساتھ کیا ہے اور انہیں ریختے کا استاد مانا ہے۔ کہتے ہیں ؎

ریختے کے تمہی استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

لیکن میر کے تتبع میں بھی اگر انہوں نے غزلیں کہی ہیں تو وہ بھی میر کے نہیں بلکہ اپنے ہی رنگ میں رنگی ہوئی ہیں۔ اس ابتدائی اشعار کی زبان اردو ہے لیکن مضمون اور زبان کی تمام خصوصیات فارسی شاعری کی ہیں، اگرچہ باقاعدہ فارسی شعر گوئی کا آغاز انہوں نے ۲۷/۱۸۲۶ء میں کیا۔

غالب کی جوانی کا بڑا حصہ عیش و آرام میں گزرا تھا۔ ان کے کلام نظم و نثر میں اس رنگین زمانے کی طرف اشارے موجود ہیں۔ ۱۸۲۶ء سے یعنی اپنے خسر نواب الٰہی بخش معروف کے انتقال کے بعد سے ان کی مشکلات کا آغاز ہوتا ہے۔ غالب کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ خاں لارڈ لیک کی علمداری میں چار سو سواروں کے رسالدار تھے۔ ان کی خدمات کے صلے میں انگریزی سرکار نے غالب اور ان کے شرکائے حقیقی کے لیے دس ہزار روپیہ سالانہ پنشن مقرر کی تھی لیکن اسی سال یعنی ۱۸۰۶ء میں یہ رقم گھٹا کر پانچ ہزار کر دی گئی۔ جس میں غالب کے حصے میں صرف ساڑھے سات سو روپے سالانہ آئے۔ غالب نے بڑے ہو کر اس ناانصافی کے خلاف اپیل کی اور اس

کے لیے انہیں کلکتے بھی جانا پڑا۔ وہاں اپریل ۱۸۲۸ء میں اپیل داخل کی۔ اگرچہ بعد میں فیصلہ اُن کے خلاف ہوا اور اُن کی اپیل نامنظور کر دی گئی۔ غالب کلکتے کے سفر سے ۲۹ نومبر ۱۸۲۹ء کو دہلی واپس آئے۔

اس سے کچھ پہلے مرزا کو ایک اور بڑا صدمہ پہنچا۔ ان کا چھوٹا بھائی مرزا یوسف دیوانہ ہو گیا اور مرتے دم تک دیوانہ ہی رہا۔

اس کے بعد غالب کی زندگی بھر مالی مشکلوں اور ناکامیوں کا سامنا رہا جو اکثر ہر بڑے فن کار کا مقدر ہوتا ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ ان مصیبتوں کے عادی ہو گئے۔ انہوں نے اپنے ذرائع آمدنی بڑھانے کی فکر کے آگے اپنی انا کو جھکنے نہیں دیا۔ چنانچہ جب ۱۸۴۰ء میں انہیں کالج میں فارسی کی پروفیسری کے لیے بلایا گیا اور چیف سکریٹری کا یہ خیال کر کے ان کے استقبال کے لیے اپنی کوٹھی سے باہر نہ نکلا کہ غالب لاکھ بڑے شاعر ہوں، اس وقت تو ایک نوکری کے لیے امیدوار کی حیثیت سے ملنے آئے ہیں تو غالب اسے اپنی ہتک قرار دے کر اس سے ملے بغیر گھر چلے آئے۔

۱۸۴۱ء میں ان کا پہلا دیوان اردو شائع ہوا اور ۱۸۴۷ء میں دوسرا ایڈیشن۔ ان کی زندگی میں ان کا دیوان اردو کل پانچ بار چھپا۔ ۲۵ مئی ۱۸۴۷ء کو انہیں جوا کھیلنے اور کھلانے کے جرم میں سزا ہو گئی اور انہیں تین ماہ جیل میں رہنا پڑا۔ یہ جیل اس مقام پر تھا جہاں اب دہلی میں مولانا آزاد میڈیکل انسٹی ٹیوٹ کی عمارت ہے۔ اس جرم میں غالب کو یہ سزا دوسری بار ہوئی تھی۔

شاہی دربار سے ان کا مستقل تعلق اس وقت قائم ہوا جب جولائی ۱۸۵۰ء میں بہادر شاہ ظفر نے شاہان تیموری کی تاریخ لکھنے کا کام ان کے سپرد کیا۔ اس سے پہلے دربار میں ان کی حیثیت محض اتنی ہی تھی کہ قصیدے اور مشاعرے پڑھتے اور انعام اور خلعت پاتے تھے۔ مگر اب اُن کا شمار باقاعدہ درباریوں میں ہونے لگا۔ بادشاہ نے نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ کا خطاب دیا، اور خلعت سے سرفراز فرمایا۔ اس کے علاوہ تاریخ نویسی کی خدمت کے عوض چھ سو روپے سالانہ وظیفہ بھی مقرر ہو گیا۔

غالب نے مغلیہ تاریخ "مہر نیم روز" کا پہلا حصہ مکمل کر لیا اور ۱۸۵۴ء میں یہ کتاب بادشاہ کے حکم سے چھپ بھی گئی لیکن دوسرا حصہ مرتب کرنے کی نوبت نہ آئی اور ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ہو گیا۔

اس کے تھوڑے عرصے پہلے اپریل ۱۸۵۲ء میں غالب کو زین العابدین خاں عارف کی موت کا صدمہ اٹھانا پڑا۔ عارف، غالب کی بیوی کے بھانجے تھے، اور ذہین اور اچھے شاعر تھے۔ غالب کو ان سے گہری محبت تھی۔ ان کے مرنے کا مرزا کو اس قدر صدمہ ہوا کہ کافی عرصے ان کی زندگی تاریک رہی۔ غالب نے عارف کی وفات پر جو دردناک نظم لکھی ہے اس کا شمار اردو شاعری کے بہترین نمونوں میں ہوتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ کیجیے ۔

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

مٹ جائے گا سر گر ترا پتھر نہ گھسے گا
ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور

آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

تم ماہِ شبِ چار دہم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور

نادان ہیں جو کہتے ہیں کہ کیوں جیتے ہو غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

عارف کے دو بیٹے تھے، حسین علی خاں اور باقر علی خاں۔ مرزا ان دونوں بچوں کو اپنے پاس لے آئے اور حقیقی اولاد سے زیادہ پیار محبت کے ساتھ ان کی پرورش کی۔

ذوق کے انتقال ۱۶ نومبر ۱۸۵۴ء کے بعد، غالب بادشاہ کے استاد مقرر ہوئے اور ۵ فروری ۱۸۵۷ء کو نواب رام پور کے استاد ہوئے۔ نواب رام پور نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد غالب کی بہت مدد کی اور سچ پوچھو تو انہی کی دستگیری تھی کہ غالبؔ کچھ وضعدار زندگی بسر کرتے رہے۔

۱۸۵۷ء میں ہندوستانیوں نے انگریزی راج کے خلاف بغاوت کر دی۔ جس نے ہندوستان کی سیاسی اور معاشی زندگی پر ایک امٹ نقش چھوڑا۔ اس جنگ نے غالبؔ کی شاعری پر بھی گہرا اثر ڈالا۔ وہ ایک حساس شاعر تھے۔ اس لیے جنگ آزادی کے حالات سے ان کا متاثر نہ ہونا ناممکن تھا۔ انھوں نے اس ہنگامے میں بہت تکلیفیں اٹھائیں۔ قید و بند سے تو وہ محفوظ رہے، لیکن اپنی پریشانیوں اور دوستوں اور عزیزوں کی موت اور صعوبتوں کے صدموں سے نہ بچ سکے۔

انگریزوں کے قبضے کے بعد دلیؔ میں بڑی تباہی مچی۔ غالبؔ کے حساس دل پر اس کی بربادی کا جو اثر ہوا وہ ان کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے۔ میر مہدی کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

> "پرسوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ تک بلا مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں وہ اگر اٹھ جائیں تو ہُو کا مکان ہو جائے ....
> .... قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا۔ اور اب جو کنوئیں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہو گیا تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائے گا۔ اللہ اللہ دِلی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہتے ہیں۔ واہ رے حسنِ اعتقادِ بندۂ خدا۔

اُردو بازار نہ رہا۔ اُردو کہاں۔ دلّی کہاں۔ واللہ اب
شہر نہیں ہے کیمپ ہے۔ چھاؤنی ہے۔ نہ قلعہ نہ شہر۔ نہ
بازار، نہ نہر ________"

غالب اس جنگِ آزادی کے بعد بارہ برس اور جیے۔ آخر عمر میں بہت کمزور ہو گئے تھے اور اکثر موت کی آرزو کیا کرتے تھے۔ انہیں اپنی موت کا شدید انتظار رہتا تھا۔ آخری عمر میں ایک لغت برہانِ قاطع سے اختلاف کی وجہ سے اُن پر اعتراضات کی زبردست بوچھاڑ ہوئی۔ اس عذاب میں وہ ایک مدت مبتلا رہے اور اس معرکے نے کئی چھوٹی بڑی کتابوں کو جنم دیا۔

بس آخر ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو بہتر برس کی عمر میں وفات پائی اور بستی نظام الدین میں خاندانِ لوہارو کی بڑواڑ میں دفن کیے گئے۔

غالبؔ کی اُردو تصانیف میں دیوانِ غالبؔ عودِ ہندی، اردوئے معلی اور فارسی میں کلیاتِ غالبؔ، پنج آہنگ، قاطع برہان، نامۂ غالبؔ، مہرِ نیم روز، دستنبو اور سبد چین بہت مشہور اور قابلِ قدر کتابیں ہیں۔

ان کے شاگرد بہت سے تھے لیکن منشی ہرگوپال تفتہ، میر مہدی مجروح، مرزا قربان علی بیگ سالکؔ، مرزا حاتم علی مہرؔ، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اور مولانا الطاف حسین حالیؔ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

غالبؔ ایک وضعدار انسان تھے گو انہیں صحیح نوابی شان کبھی میسّر نہ ہوئی مگر جہاں تک ہو سکا، انہوں نے جاگیرداروں کی تمام وضعداریاں نبھائیں ــــ حُسنِ اخلاق اور لحاظ و مروّت میں وہ عہدِ مغلیہ کے شرفا کا ایک اچھا نمونہ تھے۔

عمر کے آخری حصے میں ان کا ہاتھ بہت تنگ رہا۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنی وضعداری میں فرق نہیں آنے دیا۔ دوست احباب سے جو سلوک اچھے دنوں میں کیا کرتے تھے، وہی اس دور میں بھی جاری رکھا۔ پرانے مشرقی شعرا پر ایک عام الزام یہ ہے کہ وہ حریص اور لالچی ہوتے تھے۔ غالبؔ بھی فقیر منش اور قلندر تو نہیں تھے، لیکن محض حرص اور لالچ کے بندے بھی نہ تھے۔

اس میں شک نہیں کہ انہوں نے ذاتی مصلحتوں کی بنا پر اپنے ممدحین کی شان

میں قصیدے لکھے لیکن ان کی قصیدہ گوئی بھی اپنے اندر ایک خاص شان لیے ہوئے ہے۔ اگرچہ وہ زیادہ طویل نہیں ہیں تاہم انھوں نے جو چیز پیش کی ہے، ادبی لحاظ سے بلند ہے۔

ایک بات جو غالب کو اردو کے دوسرے شاعروں سے ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ وہ ممدوح سے سوال کرتے وقت اپنا بانکپن نہیں چھوڑتے۔ مداح سرائی کرتے ہیں مگر ساتھ ہی اپنی وضعداری بھی نبھا جاتے ہیں۔ ممدوح سے صلہ مانگتے ہیں لیکن اپنی گردن بھی زیادہ نہیں جھکاتے۔ انہوں نے بہادر شاہ ظفر کے حضور میں ایک عرضداشت بھیجی تھی جس کی شانِ نزول یہ تھی کہ شاہی دربار سے ان کو تنخواہ ہر مہینے کے بجائے پوری ایک ششماہی گذر جانے پر ملتی تھی اور ان کے یہ دن بڑی مشکل سے کٹتے تھے۔ جب اُدھار پر گزر کرتے کرتے تنگ آگئے تو درخواست کی کہ میری تنخواہ مجھے ہر ماہ عطا کی جائے۔ لیکن درخواست کے انداز میں اپنے بانکپن کو نہیں چھوڑتے کہتے ہیں ؎

آج مجھ سا نہیں زمانے میں
شاعرِ نغز گوئے خوش گفتار
رزم کی داستان گر سنیے
ہے زباں میری تیغ جوہر دار
بزم کا التزام گر کیجے
ہے قلم میری ابرِ گوہر بار
ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد
قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار

اپنی مجبوریوں اور ضرورتوں کا اظہار کیا ہے لیکن ایک ایسے پیرایہ میں کہ کسی کو یہ نہ معلوم ہو کہ غالب ایک عام خوشامدی کی طرح لال قلعہ میں دستِ سوال دراز کیے کھڑا ہے ؎

کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال
کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار

رات کو آگ اور دن کو دھوپ
بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار

اب اصل مدعا سنیئے

میری تنخواہ جو مقرر ہے
اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
رسم ہے مُردے کی چھ ماہی ایک
خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو تو ہوں بہ قیدِ حیات
اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار
بس کہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض
اور رہتی ہے سود کی تکرار
میری تنخواہ میں تہائی کا
ہو گیا ہے شریک ساہوکار

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا
آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار
میری تنخواہ کیجے ماہ بہ ماہ
تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار
ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام
شاعری سے نہیں مجھے سروکار
تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

غالب کی خودداری کو دیکھتے ہوئے گمان ہو سکتا ہے کہ خشک مزاج اور تندخو ہوں گے لیکن خشونت اور تندخوئی کجا غالب کے مزاج میں تو اس قدر

ظرافت اور شوخی تھی کہ لطیفہ گوئی اور فقرہ چست کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے اس بلا کے حاضر جواب تھے کہ سننے والوں کو اپنی بذلہ سنجی سے تڑپا دیتے تھے۔

زندگی میں اور اس سے کہیں زیادہ موت کے بعد جو قدر دانی غالبؔ کی ہوئی ہے، اردو ادب میں اقبالؔ کے علاوہ، اس کی مثال نہ ملے گی۔ ہم عصر نقاد خصوصاً جب وہ بھی شاعر ہوں اپنے زمانے کے شاعروں کی خوبیوں کے اعتراف کرنے میں ہمیشہ بخل سے کام لیا کرتے ہیں، دہلی میں غالبؔ کے ہم عصر عہد آخر میں دل کھول کر ان کی تعریف کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ دلی کے باہر بھی غالبؔ کے قدردان اور ماننے والے بہت تھے۔ مرنے کے بعد ان کی جو قدر ہوئی۔ اس کی توقع خود انہیں بھی نہ ہوگی۔ ان کے دیوان کی شرحیں اور ان کے کلام کے مختلف ایڈیشن اتنی زیادہ تعداد میں چھپے ہیں کہ تعجب ہوتا ہے۔ میرے اپنے کتب خانے میں ان کے اردو دیوان کے ۱۶۲ ایڈیشن موجود ہیں۔ غالبؔ پر اردو زبان میں اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ اب ان کا نام مٹانے سے بھی نہیں مٹ سکتا۔ غالبؔ کی مقبولیت کا سب سے بڑا سبب اس کا تنوع ہے۔ بقول ڈاکٹر بجنوری:

"لوح سے تمت تک مشکل سے سو صفحے ہیں۔ لیکن کیا ہے۔ جو یہاں موجود نہیں۔ کون سا نغمہ ہے جو اس زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں ہے؟ ——————"

شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:-

"مرزا کی شاعری بیشتر عشق و محبت کا بیان ہے۔ لیکن منطقی آئے تو اس کے لیے یہاں دلائل و براہین ہیں۔ شگفتہ طبع، لوگوں کے لیے یہاں شوخی اور ظرافت اور انسانی فطرت کی داستان سننا ہو تو یہاں وہ پتے کی باتیں ملیں گی جن کا لطف جوں جوں چشم بصیرت کھلتی جائے گی بڑھتا جائے گا۔ یہی وجہ ہے دیوانِ غالبؔ میں ہر شخص اپنی تصویر دیکھتا ہے اور لطف اٹھاتا ہے ——————"

شاعر کی حیثیت سے غالب کا رنگ دوسرے شعراء سے بالکل جداگانہ تھا۔ انہوں نے ایسے ایسے مضمون باندھے ہیں جن کی طرف ان کے پیشروؤں اور معاصرین کی نظر نہیں گئی تھی۔ انہوں نے نہ صرف اپنے لیے ایک نئی راہ نکالی بلکہ وہ اردو شاعری میں ایک نئے اور مستقل اسکول کی بنیاد رکھ گئے۔ انہوں نے اردو زبان کو بعض ایسی تشبیہیں، ترکیبیں اور استعارے دیے ہیں جن کا استعمال ان سے پہلے نہیں ہوا تھا۔

غالب ہمیشہ زندہ رہیں گے ان کا کلام کبھی باسی نہیں ہوگا۔ رفعتِ تخیل کے لحاظ سے اردو کا کوئی شاعر غالب کے مرتبے کو نہیں پہنچ سکا۔ ان کے خیالات صدیوں بعد بھی افسردہ نہیں ہوں گے۔ ان میں کچھ ایسی جدت اور تازگی ہے کہ انہیں جب بھی پڑھا جائے ایک نیا لطف آتا ہے۔ وہ جہاں بڑے کلاسیکل شاعر ہیں۔ وہاں بہت بڑے جدید شاعر بھی ہیں۔ ڈیڑھ سو سال پہلے کے کہے ہوئے ان کے کلام میں آج کے مسائل کا عکس اس شدومد کے ساتھ جھلکتا ہے کہ کلاسیکیت دم زدن میں جدیدیت کے لباس میں ملبوس نظر آنے لگتی ہے۔

آئیے تازہ دم ہو کر کلامِ غالب کا مطالعہ کریں۔

"انتخابِ کلامِ غالبؔ مع شرح"

۱ کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجیے ہم نے مدعا پایا

یہ جو کہتے ہو کہ اگر تمہارا دل کہیں پڑا ہوا مل گیا تو ہم واپس نہ کریں گے تو عرض ہے کہ دل ہے کہاں جو ہم کھو دیں اور تمہیں مل جائے؟ مگر اس چھیڑ سے ظاہر ہو گیا کہ ہمارا دل ہے ہی تمہارے پاس۔

۲ عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا

زندگی ایک درد تھی عشق، جس کی خود کوئی دوا نہیں ہے، اس کے لیے دوا بن گیا۔ اس طرح جینے کا مزا آنے لگا مطلب یہ کہ عشق کے بغیر زندگی بے لطف رہتی ہے۔

۳ دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا
آتشِ خاموش کے مانند گویا جل گیا

اندرونی جلن سے میرا دل خاک ہو گیا اس آگ کی طرح جو جلنے وقت شور نہیں مچاتی بلکہ شور کرتی ہوئی چیز کو بھی خاموش کر دیتی ہے۔

۴ میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا ‌‌ میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

میں یہاں تک مٹ گیا ہوں کہ موت کے مقام سے بھی آگے نکل گیا ہوں۔ جب میں موت کے مقام پر تھا تو کئی بار ایسا ہو گیا تھا کہ میری آگ سے بھری آہ میں وہاں کے پرندے "عنقا" (جس کا وجود نہیں ہوتا) کے پر جل جل گئے تھے مگر اب نہ میں ہوں اور نہ میں نہیں ہوں۔

۵ عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں ‌‌ کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

یہ ممکن نہیں کہ میں اپنے خیال کی گرمی کو ظاہر کر سکوں۔ ذرا جنگل میں بھٹکنے کا خیال آیا تھا کہ جنگل کو آگ لگ گئی۔

۶ شوق ہر رنگ رقیبِ سر و ساماں نکلا ‌‌ قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

عشق ظاہری آرائش کا دشمن ہے۔ مجنوں کی تصویر بھی کھینچی تو ننگی ہی کھینچی یعنی وہ ہر حال میں خستہ حال ہی دکھائی دیتا ہے۔

۷ بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل ‌‌ جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

تیری بزم سے نکلنا ہر ایک کے لیے پریشانی کا باعث ہے، وہ پھولوں کی مہک ہو، دل کی ٹیس ہو کہ محفل کے چراغ کا دھواں ہو۔

۸ دلِ حسرت زدہ تھا مائدۂ لذتِ درد ‌‌ کام یاروں کا بقدرِ لبِ دنداں نکلا

یاروں نے اسی قدر مجھ سے درد کی لذت حاصل کی جتنی ان میں قابلیت تھی ورنہ میرے یہاں درد کی لذت کی کمی نہ تھی، اس کا تو دسترخوان بچھا ہوا تھا۔ کوئی جتنا چاہے سیر ہو لے۔

۹۔ دل میں پھر گریے نے اک شور اٹھایا غالبؔ   آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

جس رونے پر میرا ایسا قابو تھا کہ میں اسے بوند برابر بھی نہ سمجھتا تھا، وہ شروع ہوا تو اس زور سے کہ بوند سے طوفان بن گیا۔

۱۰۔ دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلّی نہ ہوا   ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

جو لوگ وفا کرتے ہیں وہ گویا اپنے دل کی تسلّی چاہتے ہیں مگر ایسا ہوتا نہیں۔ وفا کر کے بھی تسلّی نہیں ملتی۔ وفا وہ لفظ ہے جس کے معنی کبھی معلوم ہی نہیں ہو سکے۔

۱۱۔ میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں   وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

میں نے چاہا تھا وفا کے دکھ سے مر کر چھٹکارا حاصل کر لوں مگر محبوب نے مجھے مرنے بھی نہ دیا کیونکہ میرے مرنے سے اس ظالم کی رسوائی ہوتی۔

۱۲۔ کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجے   ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

کس سے شکایت کریں کہ تقدیر نے ہمیں کچھ نہ دیا۔ آخرکار موت مانگی وہ بھی نہ ملی۔

۱۳۔ بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا   آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

جن کاموں کو ظاہراً آسان سمجھا جاتا ہے وہ بھی مشکل ہوتے ہیں۔ جیسے ظاہر میں تو ہر انسان، انسان ہے مگر کامل انسان بننے کے لیے سخت محنت کرنی پڑتی ہے۔ اس لیے یہ کام بھی آسان نہیں۔

۱۴۔ وائے دیوانگئ شوق کہ ہر دم مجھ کو　　آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا

میرے شوق کی دیوانگی دیکھیے کہ ہر دم یعنی ہر سانس کے ساتھ لینے وجود کی طرف لپکتا ہوں اور اس تک نہ پہنچ کر واپس آجاتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں کہ یہ کیا تماشا ہے۔

۱۵　عشرتِ قتل گہ اہلِ تمنا مت پوچھ　　عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

قتل گاہ میں جاکر عاشقوں کی مسرت کا حال مت پوچھ۔ تلوار کا میان سے نکل کر ننگا ہونا ان کے نزدیک عید کے چاند کا نکل آنا ہے۔

۱۶۔ کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ　　ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

میرے قتل کے بعد محبوب نے ظلم ہی سے توبہ کرلی کہ پھر ایسی جفا نہ کروں گا۔ ابھی ظلم اور ابھی پچھتاوا۔ یہ بھی خوب رہی۔

۱۷۔ دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا؟　　زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا؟

دوست مجھ سے ہمدردی کریں گے بھی تو کیا کریں گے؟ ناخن کاٹنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ زخم کے بھرتے بھرتے ناخن بھی تو بڑھ آئیں گے جو انہیں پھر چھیل دیں گے۔

۱۸۔ بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک؟　　ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا؟

محبوب کی بے توجہی حد سے گزر گئی ہے۔ ہم حالِ دل کہتے رہتے ہیں اور وہ سن کر بھی فرما دیتے ہیں کہ "کیا کہا" یعنی کچھ سنا ہی نہیں۔

۱۹۔ حضرتِ ناصح گر آئیں، دیدہ و دل فرشِ راہ؟ — کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا؟

حضرت ناصح (نصیحت کرنے والے) اگر تشریف لائیں تو
میرے سر آنکھوں پر مگر کوئی مجھے یہ تو بتا دے کہ وہ مجھے کیا
سمجھائیں گے؟ کیا وہی جنت اور دوزخ کے قصے؟

۲۰۔ آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں — عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا؟

آج میں ان کے یہاں تلوار اور کفن سمیت جا رہا ہوں اب
وہ یہ بہانہ نہیں کر سکتے کہ میں تجھے اس لیے قتل نہیں کر سکتا
کہ میرے پاس تلوار نہیں ہے اور بعد قتل مرنے کے ڈھانپنے
کے لیے کفن نہیں ہے۔

۲۱۔ گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی — یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا؟

اگر حضرت ناصح نے ہمیں قید کر لیا تو کیا ہوا۔ ہمارے
عشق کی دیوانگی کے انداز تو قید نہیں کیے جا سکتے۔

۲۲۔ خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں؟ — ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا؟

ہم تو زلف کے غلام ہیں اسی کے گھر میں رہتے ہیں۔ زنجیر
سے کیوں ڈریں گے اور عشق کی وفا کے گرفتار ہیں، قید
سے کیا گھبرائیں گے۔

۲۳۔ ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسدؔ — ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا؟

اے اسد (غالب)، دلی میں اب محبت کے غم کا کال ہے۔
ہم اس شہر میں رہنے کے لیے تیار ہیں مگر یہاں کیا
کھائیں گے۔ محبت کا غم جو ہمیں مرغوب ہے وہ تو یہاں
ملتا نہیں۔

۲۴۔ یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ہم مر گئے تو اچھا ہی ہوا۔ ہماری یہ قسمت ہی نہ تھی کہ دوست کا وصال نصیب ہوتا۔ بالفرض ہم چند سے اور بھی زندہ رہتے تو بھی وصالِ دوست کا انتظار ہی رہتا۔ وصال نہ ہوتا۔

۲۵۔ کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

ادھوری کھینچی ہوئی کمان کے تیر (جو جگر کے اندر گڑا رہ گیا) کی لذت کوئی مجھ سے پوچھے۔ تیر کے جگر کے پار ہو جانے پر یہ لذتِ خلش کہاں سے ہوتی جو اب تیر کے اندر گڑے رہنے سے ہو رہی ہے۔

۲۶۔ کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بری بلا ہے مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

میں کس سے کہوں کہ غم کی رات کیا ہوتی ہے۔ یہ بری بلا ہوتی ہے۔ اس کا کاٹنا بار بار مرنے کے برابر ہوتا ہے۔ کاش میں مر ہی گیا ہوتا۔ ایک ہی بار میں کام تو تمام ہو جاتا۔

۲۷۔ ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

اب جو ہم مر مری موت مرے، جنازہ اٹھا اور مزار بنا تو کتنی رسوائی ہوئی۔ سب جان گئے کہ یہ غالبِ خستہ حال کا مزار ہے۔ اگر دریا میں غرق ہو جاتے تو کسی کو خبر بھی نہ ہوتی اور قطعاً رسوائی نہ ہوتی۔

۲۸۔ یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالبؔ! تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

اے غالب تجھے تصوف کے مسائل بیان کرنے میں کمال حاصل ہے۔ اگر تو شراب خور نہ ہوتا تو ہم تجھے ولی کا درجہ دیتے۔

۲۹ درد منت کشِ دوا نہ ہوا میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

عمر میں سدا درد میں مبتلا رہا اور میرا مرض اچھا نہ ہوا تو کیا برا ہوا۔ مجھے کم از کم دوا دارو کا احسان تو نہ اٹھانا پڑا۔

۳۰ جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا

تم میری شکایت کرنے کے لیے رقیبوں (Rivals) کو کیوں اکٹھا کرتے ہو۔ یہ تو ایک تماشا ہوا۔ شکایت نہ ہوئی۔ میرے رقیب۔ تمہارے منہ سے میری شکایت کیوں سنیں؟

۳۱ جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اگر میں نے اس کی (محبوب کی، خدا کی) راہ میں جان دے دی تو کیا بڑی بات ہوئی آخر جان بھی تو اسی کی دی ہوئی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کے مجھ پر اتنے احسان ہیں کہ جان دے کر بھی چکائے نہیں جا سکتے۔

۳۲ کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں آج غالب غزل سرا نہ ہوا

غیر طرحی کلام تو سنا دیا مگر چند اشعار طرحی غزل کے بھی تو پڑھیے ورنہ لوگ کہیں گے کہ آج غالب نے کچھ نہیں سنایا۔

۳۳ میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں! گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا؟

تعجب ہے کہ میں اور میکدے سے بے پیے چلا آؤں؟ اگر میں نے (ازرہِ انکسار) توبہ کا بہانہ کر کے پینے سے انکار کر دیا تھا تو ساقی کو تو لازم تھا وہ اصرار سے پلا دیتا۔

۳۴ نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

میں جب کچھ نہ تھا تو خدا تھا اور کبھی کچھ نہ ہوتا تو خدا ہی رہتا۔
مگر میں تو کچھ ہو گیا۔ اس طرح میں خدا نہ رہا۔ اس سے الگ ہو کر
رہ گیا اور یہ بڑے گھاٹے کا سودا ہوا۔ کاش! کبھی الگ سے
میرا کوئی وجود نہ ہوتا۔

۳۵ دل، جگر تشنۂ فریاد آیا پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا

مجھے پھر وہی رونا یاد آ گیا۔ کیونکہ اسی رونے سے تیری جدائی
کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا تھا۔ اس لیے پھر جی چاہتا ہے کہ بہت سا
رونا اور فریاد کروں۔

۳۶ دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

ابھی تو وہی قیامت کا منظر کہ جب تم وداع ہوئے تھے نہیں
گزرا تھا کہ از سرِ نو اسی منظر کی یاد آ گئی۔ گویا قیامت پر
قیامت ٹوٹ گئی۔

۳۷ زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی کیوں ترا راہ گزر یاد آیا

یہی یاد کرتے کرتے کہ تو اس راستے سے گزرا کرتا تھا میری
زندگی گزر گئی مگر اس سے دکھ بھی بہت ہوا۔ کاش تیرا
راستہ یاد نہ آتا۔ زندگی تو کسی نہ کسی طرح کٹ ہی جاتی مگر
یہ دکھ تو نہ ہوتا۔

۳۸ کوئی ویرانی سی ویرانی ہے دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

جنگل کی ایسی ویرانی خدا کی پناہ۔ اسے دیکھ کر اپنا گھر
یاد آ گیا کہ ویرانی میں وہ بھی جنگل سے کم نہیں۔

۳۹۔ پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

ہمارے اعمال کے متعلق جو کچھ فرشتوں نے لکھ دیا ہے اسی کی بنیاد پر ہمیں سزا ہو جاتی ہے۔ یہ ناانصافی ہے کیونکہ فرشتوں نے جو کچھ لکھا اپنی مرضی سے لکھا۔ ہمارا کوئی آدمی تو وہاں موجود نہ تھا کہ اس سے تصدیق لے سکتے۔

۴۰۔ ریختے کے تمہی استاد نہیں ہو غالب کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

اے غالب! اردو شاعری کے ایک تمہیں استاد نہیں ہو سنا ہے کہ اگلے زمانے میں بھی ایک استاد گزرا ہے جس کا نام میر تقی میر تھا۔

۴۱۔ عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

دل محبوب کی بے التفاتی کے اتنے صدمے سہ چکا ہے کہ اب وہ اس قابل نہیں رہ گیا ہے کہ نیازمندی سے کچھ عرض کر سکے۔

۴۲۔ جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے ہوں شمعِ کشتہ، درخورِ محفل نہیں رہا

میں اپنی بے مصرف زندگی کا داغ لیے ہوئے اس دنیا سے جا رہا ہوں۔ میں اس بجھی ہوئی شمع کی طرح ہوں جو محفل کی توجہ کے قابل نہیں رہتی۔

۴۳۔ مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا

اے دل! تو اب مجھے مرنے کا کوئی اور طریقہ بتا۔ یہ تو اب ممکن نہیں رہا کہ قاتل کے ہاتھوں مروں کیونکہ مجھے قتل کرنا اب قاتل کی شان کے شایان نہیں رہ گیا یعنی اربابِ وفا ہو جانا

جھ مردود کو مارنا دونِ مرتبہ سمجھتا ہے۔

۴۴۔ گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

بے شک میں زمانے کی طرح طرح کی مصیبتوں میں گھرا رہا
ہوں لیکن ایسا تو نہیں ہوا کہ مجھے ہر لمحہ تیری یاد نہ آتی
رہی ہو۔

۴۵۔ رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف! عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

عقل کہتی ہے کہ محبوب بے مروّت ہے اور کسی سے وفا نہیں
کرتا اس لیے اے رشک! دوسروں سے اس کے میل ملاپ
کی فکر نہ کر، وہ ان سے بھی بے وفائی کرے گا۔

۴۶۔ ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

ایک تو اس پری چہرہ محبوب کا ذکر ہی دل فریب ہے، اور
دوسرے ہمارے بیان کی خوبصورتی کہ ہم محبوب پر فریفتہ
ہیں۔ یہ سننے والے کو ایسا بھا گیا کہ وہ بھی ہمارے محبوب کا
عاشق ہو گیا۔ یعنی ہمارا رقیب بن گیا۔

۴۷۔ منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے عرش سے ادھر ہوتا کاش کے مکاں اپنا

کاش ہمارا مکان عرش سے اس طرف ہوتا تاکہ ہم اس
سے بھی اوپر ایک منظر قائم کر کے اپنے مکان کو دیکھ سکتے۔
لیکن ہمارے مکان سے بلند کوئی مکان ہی نہیں۔

۴۸۔ دردِ دل لکھوں کب تک؟ جاؤں ان کو دکھلاؤں انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا

خط میں اپنے دل کا درد کب تک لکھوں۔ بہتر یہی ہے کہ جاؤں

اور محبوب کو دکھاؤں کہ دیکھو حالِ دل لکھتے لکھتے انگلیاں
کیسی زخمی ہو گئی ہیں اور قلم کیسا لہولہان ہو گیا ہے۔

۴۹۔ ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے　　بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا

ہم ایسے کہاں کے عقل مند اور ہنرمند تھے کہ آسمان کی برابری
کرنے لگتے۔ آسمان تو بے کار ہی ہمارا دشمن بنا۔

۵۰۔ رات دن گردش میں ہیں سات آسماں　　ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

آسمانوں کا مالک ہمارے لیے بڑی محنت کر رہا ہے —
ساتوں آسمان رات دن ہمارے لیے گردش میں چلتے ہوئے
ہیں۔ کچھ نہ کچھ ہو کر ہی رہے گا۔ اس لیے گھبرانے کی کوئی بات
نہیں۔

۵۱۔ پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے؟　　کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

وہ جانتے بوجھتے ہوئے بھی پوچھ رہے ہیں کہ غالبؔ کون
ہے؟ اب اس کا جواب ہم کیا دیں۔ انہیں کیا بتائیں کہ
وہ کون ہے۔

۵۲۔ عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا　　درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

قطرہ دریا ہی کا حصہ ہے اس لیے اس کی سب سے بڑی راحت
یہی ہے کہ وہ دریا میں مل کر اپنا وجود کھو دے۔ اسی طرح
جب درد حد سے گزر جائے گا تو درد کا احساس جاتا رہے گا گویا
وہی حد سے بڑھا ہوا درد بیمار کے لیے دوا بن جائے گا۔

۵۳۔ اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ　　اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

اب یہ وقت آگیا ہے اور ان کی بے توجہی کا یہی عالم ہے کہ
انہوں نے ہم پر ظلم کرنا بھی بند کر دیا ہے۔ اللہ اللہ اپنے
باوفا احباب سے اتنی دشمنی۔

۵۴۔ بقدرِ ظرف ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی — جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

اگر شراب کا دریا ہے تو میں کنارے کی وہ انگڑائی ہوں
جو نشے کے اترنے پر آتی ہے اور جس کے بعد شرابی مزید شراب
مانگتا ہے یعنی میں کنارے کی طرح ہمیشہ پیاسا رہتا ہوں۔
مطلب یہ کہ ساقی جتنی دریا دلی سے شراب پلاتا ہے۔ میں بھی
اپنی عالی ظرفی کی وجہ سے اتنا ہی پیاسا رہتا ہوں۔

۵۵۔ حُسن غمزے کی کشاکش سے چُھٹا میرے بعد — بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد

جب تک میں زندہ رہا یہ ظالم معشوق مجھے اپنے خیال میں
پھنسانے کے لیے طرح طرح کے ناز نخرے کرتے رہے۔ مگر
میرے مرنے کے بعد انہیں اس کشاکش سے نجات مل گئی۔
اب وہ کس کے لیے زیبائش و آرائش کریں آخرکار انہیں
بھی آرام مل گیا۔

۵۶۔ شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے — شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

جب شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں نہیں نکلتا ہے بلکہ
یہ شعلہ ہوتا ہے جو بجھی ہوئی شمع کے ماتم میں سیاہ رنگ کے
کپڑے پہن لیتا ہے۔ اسی طرح میرے مرنے پر میرے ماتم
میں عشق کے شعلے نے سیاہ لباس پہن لیا ہے۔

۵۷۔ کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق — ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

بہت مرنے کے بعد انسان کو پچھاڑ دینے والی عشق کی شراب
کا پینے والا کوئی نہیں رہا ہے۔ ساقی برابر پکار رہا ہے
کہ اگر کوئی اس مردافگن شراب کے پینے کا حوصلہ رکھتا ہے
تو سامنے آئے مگر کوئی نہیں آتا۔ کسی میں یہ ہمت ہی نہیں۔

۵۸۔ چھوڑوں گا میں نہ اس بتِ کافر کا پوجنا چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر
یعنی اس دین و ایمان لے جانے والے محبوب کی پوجا کرنا
ترک نہ کروں گا دنیا مجھے لاکھ کافر کہتی پھرے۔

۵۹۔ ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر
چاہے الہٰیات ہی پر گفتگو کیوں نہ ہو مگر جب تک اس
میں شراب و شعر کا تذکرہ شامل نہ کیا جائے اس میں رنگینی
نہیں آتی۔

۶۰۔ کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر
کتنا اچھا ہوتا کہ محبوب کے چہرے کی چمک دمک دیکھ کر
ہی میں جل جاتا۔ اب میں اپنی اس ہمت پر جل جاتا ہوں
کہ میں اُن کے دیدار کی تاب لا سکا۔

۶۱۔ ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر
شراب پینے کے بعد تیری مستانہ چال سے کئی لوگ قتل
ہو گئے ہیں۔ شراب کے پیالے میں جو لہریں اُٹھ رہی ہیں
وہ اُسی چال کے مستانہ پن سے ہے ظاہر ہے کہ اس قتل و
خون کا الزام مینا د شراب کی مٹکی ہی کے سر آتا ہے۔ مطلب

یہ کہ نہ تو شراب پیتا نہ لوگ قتل ہوتے۔

۶۲۔ وا حسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ — ہم کو حریص لذتِ آزار دیکھ کر

یار نے ہم کو ظلم کا خواہش مند دیکھ کر ظلم کرنا ہی بند کر دیا۔ افسوس کہ معشوق، عاشق کی بڑی خواہش بھی پوری نہیں کرتا۔

۶۳۔ بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ — لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

ہم اپنے شعر کے ساتھ خود بھی بک جاتے ہیں مگر پہلے خریدار یعنی اپنے شعر کے قدردان کو پرکھ لیتے ہیں کہ وہ میرے شعروں کی قدر بھی کر سکتا ہے کہ نہیں۔

۶۴۔ ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں — جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر

میں اپنے پاؤں کے چھالوں کو دیکھ کر گھبرا گیا تھا مگر جب دیکھا کہ راستہ کانٹوں سے بھرا ہوا ہے تو جی خوش ہو گیا کہ اب چھالے پھوٹ جائیں گے۔

۶۵۔ گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر — دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

یہ خدائی روشنی والی بجلی طور (پہاڑ) پر کیوں گری۔ وہ اسے کیونکر برداشت کر سکتا تھا۔ ہم پر گرنی چاہیے تھی کیونکہ ہم اس کے مستحق تھے۔ شراب اتنی ہی دی جاتی ہے جتنی کہ پینے والے کے ظرف (پیالے) میں سما سکے۔

۶۶۔ ہے بسکہ ہر اک ان کے اشارے میں نشاں اور — کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور

ان کی ہر ادا، ہر اشارے میں کچھ نہ کچھ فریب ہی ہوتا ہے۔

اگر وہ محبت بھی کرتے ہیں تو گمان گزرتا ہے کہ دشمنی
ہی کر رہے ہیں۔

۶۷ یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات — دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور
وہ جان بوجھ کر میری بات نہیں سمجھتے، نادان بنے رہتے ہیں۔
اے خُدا! یا تو مجھے کوئی اور زبان دے جو اُن کی سمجھ میں آجائے
یا اُن کو دوسرا دل عنایت فرما تاکہ وہ میری بات قبول
کرلیں۔

۶۸ تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اٹھیں گے — لے آئیں گے بازار سے جاکر دل و جاں اور
ہم تمہارے عشق میں اگر جان و دل گنوا دیں گے تو بھی کیا۔
یہ جنس تمہارے شہر کے بازار میں سستے داموں ملتی ہے،
جاکر اور خرید لائیں گے۔

۶۹ پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے — رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور
جب ندی نالے راہ نہیں پاتے تو اپنے کناروں کو پھاند کر
اِدھر اُدھر پھیل جاتا ہے۔ اسی طرح جب میری طبیعت
غموں کی فراوانی سے رکتی ہے تو اور رواں ہو جاتی ہے یعنی
مصیبت میں شاعری زیادہ زوردار اور رواں ہوتی ہے۔

۷۰ ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے — کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور
دنیا میں اور شاعر بھی ہیں، ایک سے ایک اچھا مگر سب
لوگوں کا اتفاق ہے کہ غالبؔ کا انداز سب سے جداگانہ ہے۔

۷۱ نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز — میں ہوں اپنی شکست کی آواز

نہ میں گیت ہوں نہ ساز کا پردہ ہوں۔ میری پُردرد لَے
تو میرے دل کے ٹوٹنے کی آواز ہے۔

۲۔ تو اور آرائشِ خمِ کاکل ــــــ میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز

تجھے تو اپنی زلفیں سنوارنے اور اپنے سجنے اور سجانے سے
کام ہے اور میں ان سوچوں میں پڑا ہوں کہ اب نہ جانے
تیرے حسن کی آرائش کیا کیا گل کھلائے گی اور کون کون تیرے
نئے چاہنے والے پیدا ہوں گے۔

۳۔ مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے ــــــ خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس

تم ایسے وقت میں اس بیمار عاشق کے پاس آئے ہو کہ انتہائی
کمزوری کے سبب وہ آنکھیں بھی نہیں کھول سکتا، اور
تمہارے سامنے ہوتے ہوئے بھی تمہیں دیکھ نہیں سکتا۔

۴۔ دہنِ شیر میں جا بیٹھیے، لیکن اے دل! ــــــ نہ کھڑے ہو جیے خوبانِ دل آزار کے پاس

اے دل! جی دکھانے والے حسینوں کے پاس تک نہ
بھٹکیے۔ ان کے قربت سے تو اچھا ہے کہ کسی شیر کے منہ
کا نوالہ بن جائیے۔

۵۔ آہ کو چاہیے اِک عمر اثر ہونے تک ــــــ کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

آہ میں اثر پیدا ہونے کے لیے ایک عمر درکار ہے اور
جب تک آہ میں اثر پیدا نہ ہوگا تیری زلف ہمارے حال
سے باخبر نہیں ہو سکتی۔ یعنی ہم جیتے جی تجھ تک اپنی فریاد
نہیں پہنچا سکتے۔

٦۔ دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ — دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

دریا میں ہر وقت حادثوں کا طوفان برپا ہے۔ نہیں معلوم موتی بننے تک بوند پر کیا کیا مصیبتیں نازل ہوتی ہیں۔ یعنی کمال کو پہنچنے کے لیے ان گنت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

٧۔ عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب — دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

عاشقی میں صبر ضروری ہے اور تمنا بے قرار ہے کہ کامیابی جلد سے جلد ہو۔ میں دل کو کیونکر ٹھہراؤں کہ جگر کے لہو ہونے تک کامیابی کی صورت نظر نہ آئے گی۔

٨۔ ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن — خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

ہم نے مانا کہ تم ہمارا حال سُن کر چلے آؤ گے مگر اس کا کیا کیجیے کہ جب تک تم کو ہماری بدحالی کی خبر پہنچے گی ہم خاک ہو چکے ہوں گے۔

٩۔ یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل — گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

ہستی کا وقفہ ایک نظر سے زیادہ نہیں ہے یعنی اس محفل کی رونق ایک چنگاری کی چمک کے برابر ہے۔

١٠۔ غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج — شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

جب تک صبح نہ ہو جائے شمع ہر طرح کی بلائیں جھیلتی رہتی ہے اور صبح ہوتے ہی بجھ جاتی ہے اور سب بلاؤں سے نجات پا لیتی ہے۔ اسی طرح اے غالبؔ! جلنے کے دکھوں کا علاج بھی سوائے موت کے اور کوئی نہیں ہے۔

۸۱ گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت دُعا نہ مانگ   یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ

اگر تجھے دعا کے قبول ہونے کا یقین ہے تو دعا مانگ کر
وقت ضائع مت کر۔ اگر دعا مانگنی ہے تو یہ مانگ کہ خدا
تجھے دلِ بے مدعا یعنی بے نیازی عطا کرے۔

۸۲ آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد   مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

اے خدا! مجھ سے میرے گناہوں کا حساب نہ مانگ کیونکہ
اس طرح مجھے وہ سب حسرتیں یاد آجاتی ہیں جن کی وجہ
سے گناہ کرنے پڑے تھے اور جو پوری نہ ہوسکیں۔

۸۳ مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور   رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

میں پردیس میں بے گور و کفن مر گیا۔ خدا نے میری بدحالی
کی لاج رکھ لی۔ اپنے وطن میں موت آتی تو کتنی رسوائی
ہوتی۔

۸۴ وہ فراق اور وہ وصال کہاں   وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

وہ راتیں، وہ دن، وہ مہینے، وہ سال کہاں گئے جن میں
میں نے جدائی اور ملاپ کے مزے اور اچھے دن
گزارے تھے۔

۸۵ فرصتِ کاروبارِ شوق کسے   ذوقِ نظارۂ جمال کہاں

وہ شوق کے کاروبار عدم فرصتی کی نذر ہو گئے۔ اب
تاک جھانک کا چسکا بھی ختم ہو گیا۔

۸۶ تھی وہ اک شخص کے تصوّر سے   اب وہ رعنائیِ خیال کہاں

یہ سب جو اوپر درج ہے، ایک شغل خیال آتے ہی یاد آجایا
کرتا تھا۔ جب دہی نہ رہا تو خیال کی بلندیاں اور رنگینیاں
کہاں رہتیں۔

۸۷ ایسا آساں نہیں لہو رونا دل میں طاقت جگر میں حال کہاں
لہو رونا کوئی آسان بات نہیں رہی۔ عشق کی نامرادیوں نے
اس نوبت کو پہنچا دیا ہے کہ دل میں طاقت نہیں اور جگر
بدحال ہے۔

۸۸ مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ وہ عناصر میں اعتدال کہاں
اے غالبؔ! شباب بیت گیا۔ اعضا کمزور ہو گئے۔ اب
متوازن زمانہ گزر چکا ہے۔

۸۹۔ کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں
محبوب نے اگر ہم سے وفا کی تو جل کر حاسدوں نے اسے
جفا کا نام دیا۔ یہ تو زمانے کا دستور ہے کہ اچھوں کو بُرا
کہا جاتا ہے اور بُروں کو اچھا۔

۹۰۔ آج ہم اپنی پریشانیٔ خاطر ان سے کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھیے کیا کہتے ہیں
آج ہم اپنے دل کی پریشانی ان سے کہنے تو جاتے ہیں مگر کیا
ان کے سامنے جا کر کچھ کہہ بھی سکیں گے؟

۹۱۔ اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں
وہ لوگ جو ناچ گانے اور شراب کو غم غلط کرنے کا وسیلہ
سمجھتے ہیں پرانے زمانے کے لوگ ہیں۔ شراب اور گانے

سے دل کا دکھ کہاں دور ہوتا ہے ۔

۹۲ آبرو کیا خاک اس گل کی جو گلشن میں نہیں — ہے گریباں ننگ پیراہن جو دامن میں نہیں

قمیص کے گلے کا چاک اگر قمیص کے دامن کے ساتھ لگا ہوا نہیں ہے تو ایسی قمیص بے کار ہے۔ اسی طرح اگر پھول باغ سے نکل جاتا ہے تو بے آبرو ہو جاتا ہے ۔

۹۳ ضعف سے اے گریہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں — رنگ ہو کر اڑ گیا جو خوں کہ دامن میں نہیں

میں نے اس قدر آنسو بہائے ہیں کہ خون تک اشکوں میں بہہ گیا اور میں اب انتہائی خستہ حال ہو گیا ہوں۔ جو خون کے آنسو دامن میں گر پڑے تھے وہ سب رنگ کی طرح اڑ گئے گویا اب خون کا قطرہ بھی میرے تن میں نہیں رہا ۔

۹۴ تھی وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربت میں قدر — بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

میں تو گھاس پھوس ہوں۔ وطن ہی میں میری کوئی عزت نہ تھی تو پردیس میں کیا ہوتی۔ میری شان تو یہی ہے کہ میں بھٹی میں رہوں۔ میرا مصرف وہیں ہے ۔

۹۵ مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت — میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

اگر کچھ رنجش ہو گئی ہے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں ہمیشہ روٹھا ہی رہوں گا۔ تم مہربان ہو کر جب جی چاہے بلا لو۔ میں گزرا ہوا وقت تو نہیں ہوں کہ واپس نہیں پلٹ سکتا ۔

۹۶ ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے — بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں

بڑھاپے کی کمزوری کے معنی یہ تو نہیں کہ میں دوسروں

کے طعنے بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ میں اُس سر کی طرح
نہیں ہوں جو گھٹنوں پر ضعف کے مارے گر پڑتا ہے
اور پھر اُٹھایا نہیں جا سکتا۔

۹۶۔ زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر ورنہ کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں
تیرے ملنے کی قسم تو میں کھا ہی نہیں سکتا کیونکہ تو میرا محبوب
ہے مگر زہر کھانے کی قسم تو میں کھا سکتا ہوں مگر افسوس
وہ ملتا ہی نہیں۔

۹۸۔ قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن
جب خرید کر شراب پینے کی طاقت نہ رہی تو قرض لے کر
پینے لگے۔ ہمیں معلوم تھا کہ ہماری یہ حرکت ایک دن ضرور
رنگ لائے گی اور ہمیں تباہ کر کے چھوڑے گی اور وہی
ہوا۔

۹۹۔ کس منہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں
اس خاص مہربانی کا شکریہ کیسے ادا کروں کہ وہ میرا حال تو
پوچھتے ہیں مگر زبان کو کام میں لائے بغیر۔

۱۰۰۔ ہم کو ستم عزیز ستمگر کو ہم عزیز نامہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں
ہم کو اس کے ستم عزیز ہیں کہ انہیں ہم بآسانی برداشت
کر لیتے ہیں اور ستم کرنے والے کو بھی ہم عزیز ہی ہوتے
ورنہ وہ ہم پر ایسے قابلِ برداشت ستم کیوں کرتا۔ اس
لیے اگر وہ ہم پر مہربان نہیں ہے تو نامہرباں بھی نہیں
ہے۔

۱۰۱ مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں — ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

اگر خواہش ہے تو کوئی بات صحرا کی خاک چھاننے سے مجھے منع نہیں کر سکتی۔ میرے پاؤں میں ایک چکر ہے جو مجھے ہر وقت چلتے رہنے پر مجبور کرتا ہے۔ کوئی زنجیر نہیں جو انہیں باندھ کر رکھے۔

۱۰۲ شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں — جادہ غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں

شوق مجھے اس ویرانے کی طرف کھینچے لیے جا رہا ہے جہاں راستہ تصویر میں کھنچی آنکھوں کی روشنی کی طرح اپنا وجود نہیں رکھتا یعنی اس راستے پر قدم رکھتے ہی حیرانی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

۱۰۳ حسرتِ لذتِ آزار رہی جاتی ہے — جادۂ راہِ وفا جز دمِ شمشیر نہیں

وفا کا ٹیڑھا میڑھا راستہ شمشیر کی طرح ہے۔ اس پر قدم رکھتے ہی مسافر کٹ مرتا ہے اور وہ اس مزے سے محروم رہ جاتا ہے جو عشق کے راستے کے دکھوں سے ملتا ہے۔

۱۰۴ رنجِ نومیدیِ جاوید گوارا رہیو — خوش ہوں گر نالہ زبونی کشِ تاثیر نہیں

مجھے ہمیشہ کی ناامیدی کا رنج گوارا ہے۔ میں خوش ہوں کہ میری فریاد میں تاثیر نہیں ہے اور وہ سنی نہیں جاتی۔ مجھے کسی کا احسان منظور نہیں۔

۱۰۵ سلطنت دست بدست آئی ہے — جامِ مے خاتمِ جمشید نہیں

شراب کا پیالہ ایک سلطنت کی طرح ہے جو کبھی کسی

کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور کبھی کسی کے ہاتھ میں ۔ یہ
جمشید بادشاہ کی انگوٹھی نہیں کہ اس پیالے کا نام کھدا
ہوا ہے ۔ جامِ جم یعنی جمشید کا پیالہ بہت مشہور تھا ۔
کہنا یہ ہے کہ اگر وہ جامِ جم میں شراب پیتا تھا تو اس کا
مطلب یہ نہیں کہ دوسرے پینے والے اس کے بعد شراب
پی ہی نہیں سکتے ۔

۱۰۶ ہے تجلی تری سامانِ وجود — ذرہ بے پرتوِ خورشید نہیں

اے خدا ! جس طرح سورج نے ذرے میں چمک پیدا
کردی ہے اسی طرح تمام عالم ترے نور سے وجود میں
آیا ہے ۔

۱۰۷ گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے — غمِ محرومیِ جاوید نہیں

ایک بار نامی گرامی اور اقبال مند ہو کر پھر مفلس ہو جانے
سے ڈر لگتا ہے ۔ مجھے اس بات کا غم نہیں کہ میں ہمیشہ
سے خوشیوں سے محروم ہوں ، یعنی ہمیشہ سے نادار ہوتا
تو کوئی بات نہ تھی ، البتہ اتنی خوشیوں کے مل جانے کے
بعد ان کے چھن جانے پر بے حد تکلیف ہوتی ہے ۔

۱۰۸ کہتے ہیں جیتے ہیں اُمید پہ لوگ — ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

سنا گیا ہے کہ لوگ اُمید پر جیتے ہیں کیونکہ جینے کی
پہلی شرط امید ہی ہے مگر ہم کو جب جینے کی بھی امید
نہیں ہے تو اب ہم کیونکر جئیں گے ۔

۱۰۹ جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں — خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

ہم بس زمین پر تیرے پاؤں کے نشان دیکھ لیتے ہیں،
ہمیں وہ ہر نشان اک چمن لگتا ہے اور محسوس ہوتا ہے
کہ ہم بہشت میں آ گئے ہیں۔

۱۱۰۔ ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم — قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

قیامت کا فتنہ تیرے آگے چھوٹا ہے کیونکہ جب تجھے قیامت
کے فتنے سے بنایا گیا تو وہ ایک آدمی کے قد کے برابر
کم ہو گیا۔

۱۱۱ بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ — تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

اے غالبؔ! ہم نے فقیروں کا بھیس اس لیے بنایا ہے
تاکہ اہلِ کرم کی نیت کے خلوص کا اندازہ کر سکیں، ورنہ
ہمیں خیرات درکار نہیں۔

۱۱۲۔ قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں — میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

میں جانتا ہوں کہ وہ میرے خط کے جواب میں کچھ بھی نہیں
لکھیں گے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ قاصد (Massanger)
کے واپس آتے آتے ایک اور خط (بطور ریمائنڈر) تیار
رکھوں۔

۱۱۳۔ مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام — ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

ان کی محفل میں مجھ تک جام پہلے تو کبھی نہیں آتا تھا،
آج خلافِ معمول ایسا کیوں ہوا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ
ساقی نے شراب میں کچھ (یعنی زہر) ملا دیا ہو۔

۱۱۴ لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا — لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

محبوب کی لاکھوں لگاوٹیں ایک سے ایک دلفریب ہوتی
ہیں مگر ایک نگاہ کا چرانا ان سے زیادہ دلفریب ہوتا ہے
گو اس کا لاکھوں بناؤ سنگھار کرنا اس کے حسن کو بہت
بڑھاتا ہے مگر اس کا ایک غصہ ہو کر بگڑ جانا اسے اور بھی
حسین و جمیل بنا دیتا ہے۔

۱۱۵ غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی — پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

اے غالب! میں نے شراب تو چھوڑ دی ہے مگر چاندنی
رات ہو یا گھٹائیں چھائی ہوئی ہوں تو ان موقعوں پر مجھ
سے نہیں رہا جاتا۔

۱۱۶ رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے — نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

عمر کا گھوڑا قابو سے باہر ہو کر بھاگا جا رہا ہے۔ اب دیکھیے
کہاں تھمتا ہے۔ ہم اس کی رفتار پر روک نہیں لگا سکتے
کیونکہ یہ ہمارے اختیار ہی میں نہیں ہے۔ خود ہماری
حالت یہ ہے کہ باگ ہاتھ سے چھوٹ چکی ہے اور پاؤں
رکاب سے نکل چکے ہیں۔

۱۱۷ اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے — حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

جب تمام عالم ایک اکائی ہے تو دیکھنے والا اور دیکھا
جانے والا بھی ایک ہوئے۔ جب ان سب کی اصل ایک
ہی ہے تو پھر جو کچھ دیکھا گیا ہے وہ بھی یہی اکائی ہوئی۔
اسے الگ کیونکر مانا جائے۔

۱۱۸ ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

جسے ہم نظر آنے والا حق سمجھتے ہیں وہ حقیقت میں غیب الغیب ہے اور عقل اور سمجھ سے پرے کی بات ہے۔ یعنی جس عقل سے ہم حق کو حق سمجھتے ہیں وہ ایک خواب میں جاگے ہوئے انسان کی طرح ہے جو اپنے آپ کو جاگا ہوا سمجھتا ہے مگر حقیقت میں سویا ہوا ہے۔

۱۱۹ چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

مجھے ہر تیز چلنے والا آدمی راہبر لگتا ہے۔ مگر تھوڑی دور تک ساتھ چلنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ وہ راہبر نہیں ہے۔ سچ یہ ہے کہ مجھے ابھی سچے راہبر کی پہچان نہیں آئی۔

۱۲۰ خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار کیا پوجتا ہوں اس بتِ بیداد گر کو میں

محبوب کے پانے کی خواہش کو بے وقوف لوگوں نے پوجا قرار دے دیا ہے۔ کیا میں اپنے ظالم محبوب کی پوجا کرتا ہوں؟ ہرگز نہیں یہ محض میری خواہش کی شدت کا دھوکا ہے۔

۱۲۱ پھر بے خودی میں بھول گیا راہِ کوئے یار جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں

عشق کے کوچے کی مستی نے مجھے ایسا بے سدھ کر دیا ہے کہ مجھے اپنی خبر کبھی نہیں رہی۔ اب میں اپنے آپ کو بھی نہیں ڈھونڈ سکتا کیونکہ اسی بے خودی میں محبوب کی گلی کا راستہ بھی بھول چکا ہوں۔

۱۲۲ اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا سمجھا ہوں دل پذیر متاعِ ہنر کو میں

میں اپنی ہی طرح دنیا والوں کو بھی ہنر دوست سمجھتا

ہوں اس لیے ہُنر کو من موہ لینے والی دولت سمجھ بیٹھا
ہوں لیکن حقیقت میں بات اُلٹی ہے نہ ہی دنیا ہنر کی
قدر دان ہے اور نہ ہُنر دولت ہے۔

۱۲۳ نالہ جُز حُسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں
ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں

ظالم! میرا نالہ و فریاد تمہارے ظلم کی شکایت میں نہیں
ہے بلکہ یہ تو تمہارے ظلم و ستم کے تقاضے کی درخواست ہے
یعنی میرا رونا دھونا دیکھ کر تم اور بھی ظلم ڈھاؤ۔

۱۲۴ عشق و مزدوریٔ عشرت گہِ خسرو! کیا خوب
ہم کو تسلیم نکو نامیٔ فرہاد نہیں

عشق میں مصیبت جھیلنے اور کسی بادشاہ کی خوشنودی
حاصل کرنے کے لیے مصیبت جھیلنے میں فرق ہے۔ فرہاد
نے پہاڑ اس لیے کاٹا تھا کہ ان پتھروں سے بادشاہ کا
محل تعمیر ہونا تھا، اس لیے ہم اُسے سچا عاشق نہیں کہہ
سکتے۔ ہمیں اس کی نیک نامی میں کلام ہے۔

۱۲۵ کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ
تم کو بے مہریٔ یارانِ وطن یاد نہیں

اے غالب! تم پردیسی ہونے کی کیا شکایت کرتے ہو۔ کیا
تم اپنے دیس والوں کی سرد مہری بھول گئے۔ وہاں تمہیں
کون پوچھتا ہے۔

۱۲۶ دو نوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کی تکرار کیا کریں

خدا نے مجھے دونوں جہان بخش دیے اور وہ سمجھا کہ
میں خوش ہو گیا مگر خدا کو کیا معلوم کہ یہ بخشش کتنی کم تھی
یہ تو میں نے شرم سے کچھ اور مانگا نہیں ورنہ مجھے تو بہت

کچھ چاہیے تھا۔

۱۲۷ تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے — تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

تیرے چاہنے والے تھک تھک کر ٹھہر گئے۔ جب
تیرا پتا نہیں ملتا ہی نہیں تو اس کے علاوہ اور کر بھی
کیا سکتے ہیں۔

۱۲۸ یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں — کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں

جدائی کے لمحوں میں ہم اپنے دیوار اور دروازے کی طرف
دیکھتے ہیں کہ شاید دیوار پھاند کر صبا پیغام لے کر آ جائے۔
دروازے کی طرف اس لیے کہ شاید پیغام کسی آدمی کے
ذریعے بھیجا گیا ہو۔

۱۲۹ وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے — کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

یقین نہیں آتا کہ وہ ہمارے گھر تشریف لائے ہیں۔ اُسے
خدا کی شان ہی کہنا چاہیے۔ ہم حیرت سے کبھی ان کو دیکھتے
ہیں اور کبھی اپنے گھر کو۔ کہ ایسا شخص اور ہمارے گھر
میں۔؟

۱۳۰ نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو — یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

لوگ حیرت سے میرے جگر کے زخم کی گہرائی کو دیکھ رہے ہیں
کہ وہ ہاتھ کتنے مضبوط ہوں گے جنہوں نے یہ زخم لگایا ہے۔
مجھے یہ ڈر ہے کہ کہیں میرے محبوب کے دست و بازو کو
لوگوں کی نظر نہ لگ جائے

۱۳۱ دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں　　خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

میں تو پتھر بھی نہیں ہوں کہ تیری چوکھٹ ہی پہ پڑا رہتا۔
ایسی زندگی پر لعنت ہے جو پتھر کے برابر بھی نہیں ہے۔

۱۳۲ کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل　　انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

ساغر اور پیالہ تو بے جان چیزیں ہیں۔ پیالہ و ساغر شراب کی تقسیم
میں اگر برابر گردش کرتے رہتے ہیں تو انہیں تکلیف نہیں
پہنچتی مگر میں تو انسان ہوں مجھے کیوں ہمیشہ گردش میں
رہنا پڑتا ہے۔ یہ میرے لیے گھبراہٹ کا باعث نہ ہو تو کیا ہو۔

۱۳۳ سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں　　خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

یہ نہایت خوبصورت شعر ہے۔ لالہ و گل دنیا کے مقبرے کی
طرف اشارہ ہے یعنی مر کر جو حسین صورتیں مٹی ہو گئیں، ان
میں سے کچھ تو پھولوں کی شکل میں ظاہر ہو گئی ہیں مگر بہت
سی باقی ہیں۔ نہ جانے ابھی کیسی کیسی خوبصورت شکلیں
دھرتی سے اُگنا باقی ہیں۔

۱۳۴ قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر　　لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

اگرچہ یعقوب (یوسف کے والد) نے یوسف کی قید کے
زمانے میں اگر یوسف کی خبر نہ لی تاہم اس کی آنکھیں ہر وقت
یوسف ہی کو تکتی رہتی تھیں۔ اس کی آنکھیں قید خانے کا
وہ سوراخ بن گئی تھیں جو قیدی کے باہر دیکھنے کے لیے بنایا
جاتا ہے۔

۱۳۵ نیند اُس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں　　تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

تیری زلفیں جس کے بازوؤں پر بکھر گئیں وہ گویا روبائی دنیا
کے دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ اب نیند، دماغ، راتیں سب
اُسی کی مطیع ہوگئی ہیں۔

۱۲۶ میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھُل گیا بُلبلیں سُن کر مرے نالے غزل خواں ہوگئیں

میرے چمن میں جانے سے میری خوش آوازی پر بلبلیں بھی
غزل خوانی کرنے لگیں بالکل اسی طرح جیسے اسکول میں
ٹیچر کی پیروی میں بچے سبق بول کر پڑھا کرتے ہیں۔

۱۲۷ رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

اگر انسان دکھ کا عادی ہو جائے تو دُکھ دُکھ نہیں رہتا۔ مجھ
پر اتنے دُکھ پڑے ہیں کہ وہ میرے لیے سُکھ بن گئے ہیں۔

۱۲۸ دیوانگی سے دوش پہ زنار بھی نہیں یعنی ہمارے جیب میں اِک تار بھی نہیں

پاگل پن کے ہاتھوں ہمارے کرتے کا ایک دھاگا بھی نہ
بچا۔ اگر دو چار دھاگے بچ رہتے تو اس کا جنیو بن کر
تو پہن لیتے۔

۱۲۹ دل کو نیازِ حسرتِ دیدار کر چکے دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں

جب دیدار کے ارمان میں ہم دل کو خاک میں ملا چکے تو معلوم
ہُوا کہ دل ہی خاک میں نہیں ملا، دیدار کرنے کی طاقت
بھی ختم ہو چکی ہے۔

۱۳۰ ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

اگر تیرا ملنا آسان نہیں یعنی مشکل ہوتا تو کام سہل یعنی

آسان ہو جاتا۔ یعنی ہم مایوس ہو کر بیٹھ رہتے اور مزید
کد و کاوش سے رہ جاتے مگر مشکل یہ ہے کہ تیرا ملنا
مشکل بھی نہیں ہے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ ہمیں عشق کی
مصیبتیں جھیلنے سے نجات حاصل نہیں ہو سکتی۔

۱۲۱ شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبالِ دوش صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

دیوانگی نے گھر میں ٹکنے نہ دیا اور ہم جنگل میں نکل گئے مگر
وہاں بھی دیوانگی کم نہ ہوئی۔ اب مشکل یہ ہے کہ جنگل میں
کوئی دیوار بھی نہیں ہے کہ اس سے سر پھوڑ کر مر جاتے۔

۱۲۲ اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

اے خدا! اس سادگی پر کون فریفتہ نہ ہو جائے کہ وہ
لڑائی کے تو درپے ہیں مگر ہاتھ میں تلوار نہیں لیتے۔

۱۲۳ دیکھا اسدؔ کو خلوت و جلوت میں بارہا دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

ہم نے اکیلے میں، اور یاروں کے بیچ، غالب کو بارہا دیکھا
ہے۔ تمہارا یہ الزام کہ اس کا دیوانہ ہونا مشکوک ہے درست
نہیں۔ ہماری رائے میں اگر اُسے دیوانہ نہیں کہہ سکتے تو
ہشیار بھی نہیں کہہ سکتے۔ یعنی اس میں کچھ نہ کچھ دیوانہ پن
ضرور ہے۔

۱۲۴ ہُوا ہوں عشق کی غارت گری میں شرمندہ سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

عشق وہ بلا ہے کہ جس گھر میں داخل ہوتا ہے اُسے برباد کر
دیتا ہے مگر مجھے افسوس ہے کہ عشق کا اس غارتگری
کی عادت کو پورا نہیں کر سکتا کیونکہ میرے گھر میں برباد

کرنے کے لیے سوائے گھر تعمیر کرنے کی خواہش کے اور
کچھ بھی نہیں۔

۱۲۵ ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ — کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

اے غالبؔ! اب ہم شعر صرف دل بہلانے کے لیے کہتے
ہیں کیونکہ ہم نے دیکھا ہے کہ ہنرمندی سے کہے گئے شعروں
کا کوئی قدرداں نہیں۔

۱۲۶ دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں — روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

کوئی ہم پر مصیبتیں بھی نازل کرے اور رونے سے بھی منع
کرے یہ ممکن نہیں۔ دل کوئی اینٹ پتھر نہیں ہے کہ
درد کی تکلیف سے رونا نہ چاہے۔ ہم ہزار بار روئیں گے
کوئی ہمیں کیوں ستائے۔

۱۲۷ دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں — بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم غیر ہمیں اٹھائے کیوں

جس پہ ہم بیٹھے ہیں وہ عام رستا ہے۔ یہ کوئی مندر یا کسی
خانقاہ کا دروازہ نہیں، کوئی مسجد یا آستانہ نہیں۔ کسی کو حق
نہیں ہے کہ ہمیں رہِ عام سے زبردستی اٹھا دے۔ ہم
اپنی مرضی سے بیٹھیں گے اپنی مرضی سے اٹھیں گے۔

۱۲۸ قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں — موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

زندگی کی قید اور دکھ کی جکڑ بندی ایک ہی چیز ہیں جب تک
زندگی سے چھٹکارا نہ مل جائے یعنی موت نہ آجائے انسان
دکھوں سے چھٹکارا حاصل نہیں کرسکتا۔

۱۴۹ واں وہ غرورِ عزّ و ناز یاں یہ حجابِ پاسِ وضع — راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں

انہیں اپنی عزت کا غرور ہے کہ وہ ہمیں اپنی محفل میں بلانے سے
گریز کرتے ہیں اور ہمیں وضعداری مجبور کرتی ہے کہ ہم رستے
میں اُن سے کہاں ملتے پھریں۔ اب بات یہاں ٹھہری ہوئی ہے
کہ وہ ہمیں بلاتے نہیں اور ہم ان سے ملتے نہیں۔

۱۵۰ ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی — جس کو ہو دین و دل عزیز اسکی گلی میں جائے کیوں

چلیے جیسا واعظ نے کہا ہے ہم نے مان لیا۔ محبوب خدا کو نہیں
مانتا، نہ سہی، بے وفا ہے تو ایسا ہی سہی مگر میں پوچھتا ہوں
جس کو دین و دل کے چھن جانے کا خیال ہے وہ محبوب کی
گلی میں جاتا ہی کیوں ہے۔

۱۵۱ غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں — روئیے زار زار کیا، کیجیے ہائے ہائے کیوں

غالب مر گیا تو کیا ہوا۔ اس ٹوٹے پھوٹے شاعر کے بغیر کون
سے کاروبار بند ہو گئے۔ آپ کیوں زار زار روتے ہیں،
ہائے ہائے کیوں کرتے ہیں۔

۱۵۲ غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یُوں — بوسے کو پوچھتا ہوں مَیں مُنہ سے مجھے بتا کہ یُوں

مَیں نے یہ جو پوچھا ہے کہ بوسہ کیونکر لیا جاتا ہے تو تُو مجھے
منہ بند کلی دکھا کر مت بتا کہ بوسہ یُوں لیتے ہیں بلکہ میرے
پاس آکر میرا بوسہ لے کر دکھا۔

۱۵۳ مَیں نے کہا کہ بزمِ ناز غیر سے چاہیے تہی — سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ یُوں

مَیں نے جب ایک غیر آدمی کو محفل میں بیٹھے دیکھا تو عرض
کیا کہ یہ حسینوں اور ان کے چاہنے والوں کی محفل ہے۔

[illegible]
[illegible]
عزیز تھا۔

۵۲۔ نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

اگر دن میں میرا اسباب لٹ نہ لیا گیا ہوتا تو میں یوں رات کو اتنی بے فکری سے نہ سو سکتا۔ اب مجھے چوری کا ڈر نہیں اس لیے چور کو اس احسان کے لیے دعا دیتا ہوں کہ اس نے میرا مال و اسباب لوٹ کر مجھے بے فکری کی دولت سے مالا مال کر دیا۔

۵۳۔ کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

جب کسی کو دل دے دیا ہے تو اب فریاد و فغاں کیسی۔ جب دل ہی سینے میں نہ رہا تو پھر منہ میں زبان کیوں رہے۔

۵۴۔ وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

وہ اپنی عادت سے مجبور ہیں ہمیں اپنا رنگ ڈھنگ پسند ہے۔ اب گر سرگراں سے کیوں پوچھیں کہ ہم سے کیوں رنجیدہ ہو۔ وہ روٹھنے میں ہوشیار ہیں تو ہم منانے میں خوددار ہیں۔

۵۵۔ وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

اب وفا کی کیا بات رہ گئی ہے اور عشق کا کیا مطلب رہ گیا ہے۔ اگر سر پھوڑنا ہی کی بات ہے تو اس کے لیے تیری چوکھٹ

کا پتھراؤ کیا ضروری ہے ہم کسی بھی پتھر سے سر خرد کر لیں گے۔

۱۵۸ یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے! ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

جس کے تم دوست بن جاؤ تقدیر کو اس کا دشمن بننے کی
ضرورت نہیں۔ تمہاری دوستی ہی اس کی بربادی کے لیے بہت ہے۔

۱۵۹ نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

اے غالب! تو سمجھتا ہے کہ طعنہ دینے سے تو کام نکال لے جائے گا
اور یہ جو تو سمجھتا ہے کہ وہ ترے کہے کا ہمیشہ الٹ ہی کرتا ہے
یعنی تو اُسے "بے مہر" کہے گا تو وہ تجھ پر "مہربان" ہو جائے گا،
تو ایسا کبھی نہیں ہونے کا۔

۱۶۰ رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

ہمیں ان سے اتنی تکلیفیں پہنچی ہیں کہ اب جی چاہتا ہے کہ
کہیں ایسی جگہ چل کر رہا جائے جہاں ہم وطن، ہم سخن کوئی
موجود نہ ہو۔

۱۶۱ بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

ایک ایسا گھر بنائیں جو دیواروں اور کھڑکیوں سے آزاد ہو۔
یعنی چھپر کھٹ ہو۔ وہاں ہمارا نہ ہی کوئی پڑوسی ہو اور نہ
کوئی محافظ۔

۱۶۲ پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

اگر ہم بیمار پڑ جائیں تو ہماری تیمارداری کو کوئی نہ آئے اور
اگر مر جائیں تو کوئی ماتم کرنے والا نہ ہو۔

۱۶۳ مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے — بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیے

اے واعظ! مسجد کے برابر میخانہ ہونا چاہیے۔ اسی طرح جس طرح خدا نے ابرو کے پاس آنکھ رکھ دی ہے (یہاں غالب نے ابرو کو مسجد کی محراب سے تشبیہہ دی ہے اور آنکھ کو میخانے سے)

۱۶۴ مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو — اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

کس بدبخت کی شراب پینے سے یہ غرض ہے کہ نشاط و سرور حاصل کرے۔ مجھ کو تو دن رات تھوڑی سی بے خودی درکار ہے۔

٭ ٭ ٭

۱۶۵ عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی — میری وحشت تری شہرت ہی سہی

تو جو کہتا ہے کہ مجھے عشق نہیں بلکہ پاگل پن کا جوش ہے تو یوں ہی سہی۔ مجھے اطمینان ہے کہ میری دیوانگی سے تجھے شہرت تو ملی۔

۱۶۶ قطع کیجے نہ تعلق ہم سے — کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

آپ مجھ سے ناتا تو نہ توڑیے۔ مجھ سے دشمنی تو رکھیے کیونکہ دشمنی بھی تو ایک تعلق ہے۔

۱۶۷ ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے — بے نیازی تری عادت ہی سہی

جیسے جیسے معلوم ہو جائے گا کہ بے نیازی تیری عادت ہے ویسے ویسے ہم سر تسلیم خم کرتے چلے جائیں گے کیونکہ ہم تو ہر حال میں تیرے گرویدہ ہیں۔

٭ ٭ ٭

۱۶۸ اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالب — ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

جنگل میں ہمارے بھٹکتے پھرنے سے گھر ویران ہو گیا ہے۔ اور در و دیوار ہری گھاس سے بھر گئے ہیں۔ عجیب عالم ہے کہ ہم اجاڑ بیابان میں بھٹک رہے ہیں اور گھر میں بہار کا موسم آیا ہوا ہے۔

۱۶۹ دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا — میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اس کی تقریر کی لذت کا کیا کہنا۔ میں نے جب اسے سنا تو مجھے لگا کہ یہ سب کچھ تو گویا پہلے ہی سے میں جانتا تھا۔

۱۷۰ گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے با ایں ہمہ — ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

اگرچہ وہ برے لفظوں میں ہے مگر میرا ذکر مجھ سے بہتر ثابت ہوا کہ ان کی محفل میں ہو رہا ہے۔ میرا تو اس محفل میں داخلہ تک ممنوع ہے۔

٭ ٭ ٭

۱۷۱ دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی — دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

تیری نگاہ اس طرح پڑی کہ ایک ہی ادا میں دل اور جگر دونوں میں اتر گئی۔ اب دونوں تجھ پر فریفتہ ہیں۔

۱۷۲ وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں — اٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

اب وہ رات کی پی ہوئی شراب یعنی جوانی کی سرمستیاں کہاں ہیں۔ بیدار ہونے کا وقت آگیا ہے۔ صبح کے سونے کی لذت ختم ہوئی۔ بڑھاپا آن پہنچا ہے۔

٭ ٭ ٭

١٠٢ کوئی اُمید بر نہیں آتی　　کوئی صورت نظر نہیں آتی

عمر ناکامی میں گزر رہی ہے۔ حالات کے سنبھلنے کی کوئی
اُمید نہیں۔

١٠٣ موت کا ایک دن معین ہے　　نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

جب معلوم ہے کہ موت کا وقت مقرر ہے تو آنکھوں سے
نیند کیوں غائب ہو گئی؟ موت کو جب آنا ہو گا آ جائے گی۔

١٠٤ آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی　　اب کسی بات پر نہیں آتی

پہلے تو میں اپنے دل کی حالت پر ہنس دیا کرتا تھا مگر اب
مصیبتیں اتنی بڑھ گئی ہیں کہ خوشی کی بات پر بھی ہنسی نہیں
آتی۔

١٠٥ جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد　　پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

معلوم ہے کہ عبادت اور پارسائی بڑے ثواب کی بات
ہے مگر اس کا کیا کیا جائے کہ طبیعت اِدھر راغب ہی
نہیں ہوتی۔

١٠٦ ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں　　ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

مجھے آپ کے سب راز معلوم ہیں۔ میں آپ کی رسوائی کے
خوف سے منہ نہیں کھولتا ورنہ بات کرنے میں بند نہیں
ہوں۔

١٠٧ ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی　　کچھ ہماری خبر نہیں آتی

بے خودی اور سرمستی نے ہمیں اس مقام پر پہنچا دیا ہے

جہاں ہمیں بھی اپنی خبر نہیں معلوم۔

۱۷۹ مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی — موت آتی ہے پر نہیں آتی

کتنی خواہش ہے کہ موت آجائے اور اس دکھ بھری دنیا سے چھٹکارا مل جائے مگر موت آتی ہے تو اوروں کو، مجھے نہیں آتی۔

۱۸۰ تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے — حورانِ خلد میں تری صورت مگر ملے

اگر بہشت کی حوروں سے تری شکل ملتی جلتی ہو تو ہم انھی کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی کریں۔ حوریں تیری برابری نہیں کر سکتیں اس لیے انہیں دیکھ کر دل کو تسکین نہیں ہو سکتی تاہم نظروں کا شوق پورا ہو جائے گا تو یہی بہت ہے۔

۱۸۱ اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعدِ قتل — میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

مجھ کو قتل کر کے اپنی ہی گلی میں دفن نہ کرنا۔ میں یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ غیر میری قبر کے پتے سے تیرے گھر کا پتا معلوم کریں۔

۱۸۲ ساقی گری کی شرم کرو آج ورنہ ہم — ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے

آج تم ساقی بنے ہو تو کچھ اس کی لاج رکھو اور ہمیں چھلکا کر پلا دو ورنہ پینے کو تو جو تھوڑی بہت ہمیں ملتی ہے وہ ہم ہر شام پیا ہی کرتے ہیں۔

۱۸۳ تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم! — میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

اے دوست! مجھے تجھ سے کچھ شکایت نہیں۔ ہاں اگر

میرا پیغام لے کر جانے والا (نامہ بر) کہیں مل جائے تو
میرا شکایت بھرا سلام پہنچا دینا۔

۱۸۴ دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے ؟ آخر اس درد دوا کیا ہے ؟

اے مورکھ دل ! تجھے کیا ہو گیا ہے تو کیوں اپنی حرکتوں
سے باز نہیں آتا۔ ہم تیرے دکھ کی کیا دوا کریں۔

۱۸۵ ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار یا الٰہی ! یہ ماجرا کیا ہے ؟

عاشق ابھی عشق کے کوچے میں نیا نیا اترا ہے اس لیے
معشوق کی روایتی بے نیازی کو دیکھ کر حیران ہے اور کہتا
ہے۔" ہم اس کے لئے مشتاق ہیں اور وہ ہم سے اتنا بیزار
ہے۔ اے خدا یہ کیا ماجرا ہے"۔

۱۸۶ جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود (ق) پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے ؟

اے خدا جب تیرے سوا دنیا میں کوئی اور ہے ہی نہیں تو
یہ میں اور تو کا شور کیا ہے ؟

۱۸۷ یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں ؟ غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے ؟

یہ پریوں کے سے حسین لوگ کون ہیں ؟ ان کے ناز، ادائیں
اور گھاتیں کیا ہیں ؟

۱۸۸ سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں ؟ ابر کیا چیز ہے ؟ ہوا کیا ہے ؟

یہ باغ بغیچے اور پھول کہاں سے آئے ہیں ؟ یہ بادل کیوں
ہے ؟ اور یہ ہوا کیا ہے ؟ انہیں کس نے بنایا ؟ مطلب
یہ کہ ان دلفریبیوں کے ہوتے ہوئے خدا کی طرف رجوع مشکل

ہو گیا ہے۔

۱۸۹ ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید جو نہیں جانتے وفا کیا ہے ؟

ہم دانا ہو کر بھی کتنے نادان ہیں کہ اُن سے وفا کی اُمید رکھتے ہیں اور وہ کتنے نادان ہیں کہ انہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ وفا کس چڑیا کا نام ہے۔

۱۹۰ تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

تیری وفا سے تیرے ہی کیے ہوئے ظلموں کی تلافی تو ہو سکتی ہے مگر اس کا کیا کیا جائے کہ ہم پر تیرے ظلموں کے علاوہ اور بھی بہت سے ظلم ہوئے ہیں۔ ان کی تلافی کیونکر ہو۔

۱۹۱ لکھتے رہے جنوں کی حکایات خوں چکاں ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

ہم اپنے عشق کی خون سے بھری ہوئی کہانیاں لکھنے سے باز نہ آئے۔ حالانکہ کئی بار ایسا ہوا کہ زمانے نے ہمیں روکا اور ہمارے ہاتھ قلم کر کے رکھ دیئے۔

۱۹۲۔ اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل ! زنہار! اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے

اے ہوا و ہوس میں نئے نئے گرفتارو! خبردار — اگر تمہیں رقص و شراب کی ہوس ہے۔

۱۹۳ دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو میری سنو جو گوشِ حقیقت نیوش ہے

تو مجھ کو دیکھو اور مجھ سے عبرت حاصل کرو۔ اگر سچی بات سننے والے کان رکھتے ہو تو میری داستان سنو۔

۱۹۴ ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی　　مُطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

ساقی اپنی تمام تابانی کے ساتھ ایمان اور عرفان کا دشمن ہے
اور گویا اپنے سنگیت کے ساتھ عزت اور ہوش لوٹ
لے جانے والا ہے۔

۱۹۵ یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط　　دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے

یا تو رات کو یہ حال تھا کہ فرش کا ہر گوشہ باغبان کا دامن
اور پھول بیچنے والی کی ہتھیلی بنا ہوا تھا

۱۹۶ لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ　　یہ جنّتِ نگاہ، وہ فردوسِ گوش ہے

اور ساقی کی مستانہ چال اور ساز کی آواز من موہنے لیے جاری
تھی۔ ایک نگاہوں کے لیے جنّت تھی اور ایک کانوں کے
لیے فردوس

۱۹۷ یا صبح دم جو دیکھیے آکر تو بزم میں　　نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

یا صبح کے وقت آکر دیکھا تو یہ دیکھا کہ بزم میں نہ تو سازوں
کی آواز تھی، نہ اہلِ محفل کا سوز و گداز تھا۔ سب جوش و خروش
ختم ہو چکا تھا

۱۹۸ داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی　　اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

فقط رات کی محفل کے فراق کے صدمے سے جلی ہوئی ایک
شمع باقی رہ گئی تھی۔ اب وہ بھی خموش ہے۔

۱۹۹ آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں　　غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

یہ جو بلند مضامین میں نے اوپر بیان کیے ہیں، غیب

سے آتے ہیں۔ میری اپنی فکر نہیں ہیں۔ اے غالبؔ! میرے
قلم کے چلنے کی آواز، آواز نہیں فرشتوں کی نوا ہے۔

۲۰۰ نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے — کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

محبوب ہر بات میں نکتہ چیں ہے اس لیے اُسے اپنا دکھ سنانے
سے کچھ حاصل نہیں۔ وہاں بات کیا بن سکتی ہے جہاں نکتہ چینی
کے ڈر سے بات بھی بنانی ممکن نہ ہو۔ یعنی جھوٹ موٹ بھی کچھ
نہ کہا جاسکے۔

۲۰۱ عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ — کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

عشق پر کسی کا قابو نہیں۔ یہ وہ آگ ہے جو لگانے سے
لگ نہیں سکتی اور بجھانے سے بجھ نہیں سکتی۔

۲۰۲ ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تُو کیا ہے — تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

ہر ایک بات پر ارشاد ہوتا ہے کہ تیری کیا حقیقت ہے یعنی
مجھے ذلیل کیا جاتا ہے۔ میں آپ ہی سے پوچھتا ہوں کہ
شُرفا سے بات کرنے کا یہ کیا طریقہ ہے۔

۲۰۳ جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا — کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے؟

جہاں جسم کو جلایا ہے اُسی کے ساتھ دل بھی جل گیا ہوگا۔
اب جو راکھ کو کریدتے ہو تو یہ کیا جستجو ہے؟ اس کا مطلب
یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جسم بھلے ہی جلا ہے مگر اس کے ساتھ دل
تو نہیں جل گیا ہوگا۔ اسے راکھ میں کیوں ڈھونڈتے ہو۔
غالبؔ نے ہندوؤں کو کسی شمشان میں پھول چُنتے دیکھا
ہوگا اور وہاں سے یہ بات پیدا کی جو قابلِ داد ہے۔

۲۰۴ رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

جو خون رگوں میں دوڑتا ہے اور زندگی بخشتا ہے ہم اسے
لہو نہیں سمجھتے۔ لہو تو وہ ہے جو عاشق کی آنکھ سے اشک
بن کر ٹپکے۔

* * *

۲۰۵ ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

وہ جب تیمارداری کے لیے آتے ہیں تو اُن کو دیکھ کر
عاشقِ بیمار کا چہرہ کھِل اٹھتا ہے۔ افسوس کہ چہرے کی
اس رونق سے وہ سمجھتے ہیں کہ عاشق اب ٹھیک ہو گیا ہے
جو درست نہیں۔

۲۰۶ ہم کو معلوم ہے جنّت کی حقیقت لیکن دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

ہم جانتے ہیں کہ جنّت کی حقیقت کیا ہے پھر بھی اے غالبؔ!
دل کے بہلائے رکھنے کے لیے یہ خیال اچھا ہے۔

۲۰۷ بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مرے آگے ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

یہ شعر ہندوؤں کے لیلا کے تصوّر پر مبنی ہے۔ غالبؔ
کہتا ہے اس دنیا کو میں لڑکوں کا کھیل سمجھتا ہوں۔ یہ
ایک تماشا ہے جو دن رات مرے آگے ہوتا رہتا ہے۔

۲۰۸ اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

میں معجزوں کا قائل نہیں اس لیے میں تختِ سلیمان کو
ایک کھیل سمجھتا ہوں اور مسیح کے چمتکار کی وقعت مرے
آگے ایک معمولی بات سے زیادہ نہیں۔

* * *

۲۰۹ جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور　جز وہم نہیں ہستیٔ اشیا مرے آگے

عالم کی صورت محض اک نام ہے اور موجودات کی ہستی
ایک وہم کے سوا کچھ نہیں۔

۲۱۰ گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے　رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

اگرچہ اب ہاتھ نہیں ہلتا اور جام اٹھانے کی طاقت نہیں
تاہم آنکھوں میں تو بصارت باقی ہے۔ ابھی شیشہ و ساغر کو
مرے آگے پڑا رہنے دو۔

۲۱۱ ابنِ مریم ہوا کرے کوئی　میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی

کوئی لاکھ مریم کا بیٹا (یعنی مسیح) ہوا کرے۔ بات جب
ہے کہ وہ میرا دکھ دور کرے۔

۲۱۲ بات پر واں زبان کٹتی ہے　وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

اگر کوئی ان کے خلاف کچھ کہہ دے تو زبان کاٹ لی
جاتی ہے۔ اس لیے اچھی بری وہ جیسی بھی کہیں سننی پڑتی
ہے۔

۲۱۳ بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ　کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

پاگل پن میں بہت کچھ بکے جا رہا ہوں۔ جائز اور ناجائز
سب کچھ۔ خدا کرے کہ میری بات کسی کی سمجھ میں نہ آئے۔

۲۱۴ جب توقع ہی اُٹھ گئی غالبؔ　کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

اے غالبؔ! کچھ اُمید ہو تو گلہ شکوہ بھی کیا جائے۔ جب
ہر طرف ناامیدی ہی کا دَور دورہ ہے تو پھر شکوہ شکایت

بے کار ہے۔

۲۱۵ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ایسی ہزاروں خواہشیں ہیں جنہیں جلد سے جلد پورا ہوتے دیکھنے کی شدید خواہش ہے۔ ان میں سے بہت سی پوری بھی ہو گئی ہیں لیکن بہت سی باقی ہیں۔ مطلب یہ کہ انسان کے ارمان کبھی پورے نہیں ہوتے۔

۲۱۶ نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

یہ تو بارہا سنا ہے کہ آدم کو جنت سے بڑی بے عزتی کے ساتھ نکالا گیا تھا۔ مگر جس طرح بے آبرو ہو کر ہم تیری گلی سے نکلے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہے۔

۲۱۷ واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو!
کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

اے واعظ! تمہاری پاک شراب یعنی شراب الٰہی تو محض قصہ کہانی کی باتیں ہیں۔ وہ شراب ہی کیا جسے نہ تم پی سکو اور نہ کسی کو پلا سکو۔

۲۱۸ گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

مانا کہ یہ بت کعبے سے نکال دیے گئے تھے اور اب یہ وہاں نہیں ہیں مگر یہ کبھی وہاں رہ چکے ہیں اس لیے ان بتوں کو کعبہ سے دور ہی کی سہی نسبت تو ہے۔

۲۱۹ مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

زمانہ ہو گیا ہے اپنے دوست کی مہمانداری نہیں کی۔ شعلۂ شراب کو

پیالے میں انڈیل کر محفل میں چراغاں نہیں کیا۔

۲۲۰ کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے

پھر جگر کے بکھرے ہوئے ٹکڑے جمع کر رہا ہوں۔ بہت زمانہ ہو گیا ہے
کہ تیری پلکوں کی دعوت نہیں کی ہے یعنی کبھی ٹکڑوں کو تیرے روبرو
پیش نہیں کیا ہے۔ مطلب کہ محبوب نے مدت سے میرے جگر کے ٹکڑے جو
اس کے فراق میں ہوتے ہیں، نہیں دیکھے۔

۲۲۱ مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے

پھر جی چاہتا ہے کہ محبوب اپنی سیاہ زلفوں کو چہرے پر لہراتے ہوئے
لبِ بام آجائے تاکہ میں اس کا دیدار کر سکوں۔

۲۲۲ جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

دل پھر وہی اکیلا اور بے فکری کا موسم ڈھونڈتا ہے تاکہ ہم رات
دن محبوب کو یادوں میں بسائے بیٹھے رہیں۔

۲۲۳ بہ قدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

میں جو کچھ چاہتا ہوں، اس کے لیے غزل کا میدان کافی نہیں۔ میرے
بیانِ شعر کے لیے وسیع تر میدان چاہیے۔

۲۲۴ ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

غالب نے یہ اشعار خاص رنگ میں کہے ہیں۔ ہم پیشہ
نکتہ دانوں کو چاہیے کہ وہ بھی یہی طرزِ ادا اختیار کریں۔

☆ ☆ ☆

[ذیل کے ۱۵ شعر وہ ہیں جو غالب کے مروجہ دیوان میں نہیں۔ ان مشکل اشعار کی شرح بھی حتی الوسع آسان زبان میں کر دی گئی ہے۔]

۲۲۵۔ عالم طلسم شہرِ خموشاں ہے سر بسر
یا میں غریب کشورِ بود و نبود تھا

میرے لیے یہ دنیا سراسر گورستان کے طلسم کی طرح تھی، حقیقت سے کوسوں دُور۔ یا ہست و نیست کے ملک میں مَیں پردیسی تھا جس پر اصلیت کبھی نہیں کھُلی۔

۲۲۶۔ جلوہ مایوس، نہیں دل، نگرانی غافل
چشمِ امّید ہے، روزن تری دیواروں کا

اے غافلِ نگرانی (بے خبر) دوست! تو یہ نہ سمجھ کہ دل تیرے جلوے کی آس کھو بیٹھا ہے۔ امید کی آنکھ تیرے دیوار کی روزن کی طرح ہے وہ تجھے ایک نہ ایک دن دیکھ ہی لے گی۔

۲۲۷۔ نہ بخشی فرصتِ یک شبنمستاں جلوۂ خور نے
تصور نے کیا ساماں ہزار آئینہ بندی کا

ہم نے تصوّر میں محبوب کے استقبال کے لیے شبنم کے آئینوں سے بزم سجائی مگر خورشید کی ایک ہی جھلک نے تمام آرائش ملیا میٹ کر دی یعنی شبنم خشک ہو گئی۔

۲۲۸۔ ہمہ ناامیدی، ہمہ بدگمانی
مَیں دل ہوں فریبِ وفا خوردگاں کا

مَیں فریبِ وفا کھانے والوں کا دل ہوں۔ سر تا پا نااُمیدی ہوں اور مجسّم بدگمانی ہوں۔ یعنی وفا ایک فریب ہے جس سے مایوسی اور بدگمانی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

۲۲۹۔ دلِ دردہ کا پھیلا خانہ خراب صحرا
موجِ سراب صحرا، عرضِ غبار صحرا

دل عراہیں بھٹکنے کا اس قدر مشتاق ہے کہ خانہ خراب ہو کر رہ گیا ہے۔ صحرا کے سراب (یعنی فریب) بھی موجِ صحرا کے لٹنے کے آثار یعنی ویرانی ہی کا دوسرا نام ہے۔

۲۳۰۔ بسکہ آئینے نے پایا گرمیٔ رخ سے گداز
دامنِ تمثال مثلِ برگِ گل، تر ہو گیا

محبوبِ آتشیں رخ نے جب بہرِ آرائش آئینہ دیکھا تو گرمیٔ رخ سے آئینہ پگھل گیا، چنانچہ محبوب کے عکس پُرنم کا دامن تازہ دھلے ہوئے پھول کی طرح تر ہو گیا۔

۲۳۱۔ ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب؟
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

غالب نے سفر دو قدم میں پورا کیا ہے۔ کہا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا ہر وسعت ہم نے تمنا کے ایک قدم میں پوری کر لی۔ اب دوسرا قدم کہاں رکھیں کیونکہ ارمان تو ابھی باقی ہی ہیں۔ یعنی تمنا کا سفر ادھورا ہی رہتا ہے۔

۲۳۲۔ خود پرستی سے رہے باہم دگر نا آشنا
بے کسی میری شریک، آئینہ تیرا آشنا

ہم دونوں اپنی انا میں گرفتار، ایک دوسرے کے لیے قطعی اجنبی رہے۔ بے کسی میرے ہر حال میں شامل رہی اور تو نے آرائش کی دھن میں ہمیشہ آئینے کو دوست بنائے رکھا۔

۲۳۳- جب کہ نقشِ مدّعا ہووے نہ جُز موجِ سراب
وادیٔ حسرت میں پھر آشفتہ جولانی عبث

جب نقشِ مدّعا (وہ نقش جس پر مدّعا تحریر کیا گیا ہو) ایک فریب کے سوا کچھ نہیں یعنی مدّعا حاصل ہی نہیں ہو سکتا تو پھر وادیٔ حسرت میں سرگرمِ جستجو رہنا بے سود ہے۔

۲۳۴- تھا میں گلدستۂ احباب کی بندش کی گیاہ
مُتفرّق ہوئے میرے رفقا، میرے بعد

میں اس گھاس کی ڈوری کی طرح تھا جس نے گلدستۂ احباب کو باندھ رکھا تھا۔ میرے اُٹھ جانے کی دیر تھی کہ میرے سب رفیقِ کار تنکوں کی طرح بکھر گئے۔

۲۳۵- میں آپ سے جا چکا ہوں، اب بھی
لے بے خبری اُسے خبر کر

اُس کی محبّت میں مَیں اپنے ہوش و حواس کھو چکا ہوں۔ کاش اب بھی اس بے خبر کو میری حالت کی خبر ہو جائے اور میرا حال دیکھ کر وہ کچھ رحم فرمائے۔

۲۳۶- گُل کِھلے، غنچے چٹکنے لگے اور صبح ہوئی
سرخوشِ خواب ہے، وہ نرگسِ مخمور ہنوز

غنچوں نے چٹکنا شروع کر دیا ہے، پھول کِھلنے لگے ہیں، صبح ہو گئی ہے۔ سارا عالم نیند سے فارغ ہو رہا ہے مگر وہ نرگسِ مخمور یعنی محبوب ابھی تک محوِ خواب ہے۔

۲۳۷- ہجومِ فکر سے دل مثلِ موج لرزے ہے
کہ شیشہ نازک و صہبا ہے آبگینہ گداز

اتنے ارفع خیالوں کے ہجوم سے دل موج نے کی طرح کانپ رہا ہے کیونکہ شیشہ جس میں خیالوں کی شراب ہے، نازک ہے اور خیالوں کی شراب ایسی گرم ہے کہ وہ آبگینے کو پگھلائے جا رہی ہے۔ ان بلند مضامین کا اظہار کیونکر ممکن ہوگا۔

۲۳۸- عیسیٰ مہرباں ہے شفا ریز یک طرف
دردآفریں ہے طبعِ الم خیز یک طرف

ایک طرف عیسیٰ مہرباں مجھے شفا بخش رہا ہے، دوسری طرف میرا غمگین مزاج درد پیدا کیے جا رہا ہے۔

۲۳۹- تماشائے گلشن، تمنائے چیدن
بہار آفرینا! گنہ گار ہیں ہم

پھلوں پھولوں سے لدے باغ کو دیکھا تو پھل پھول چن کر دامن بھر لینے کی زبردست تمنا پیدا ہوئی۔ اے بہار کے پیدا کرنے والے! ہم تو شدید تمنا کے سبب پھل پھول توڑنے سے پہلے ہی گنہگار ہو گئے۔

یا

ہر بھرے باغ کو دیکھیں گے تو پھل پھول توڑنے کی تمنا تو ہوگی ہی۔ اے بہار کے پیدا کرنے والے! تو نے ہمیں گنہ گار بنا دیا۔

۲۴۰- بسکہ وہ چشم و چراغِ محفلِ اغیار ہے
چپکے چپکے جلتے ہیں جوں شمعِ خلوت خانہ ہم

محبوب غیروں کی محفل کی رونق بنا ہوا ہے اور ہم تنہا خلوت خانے کی شمع کی طرح خاموشی سے جل رہے ہیں۔

۲۴۱۔ دیر و حرم، آئینۂ تکرارِ تمنّا
واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

مسجد میں جانا، مندر میں درشن کرنا، وغیرہ سب تمنّا کی تکرار کو ظاہر کرتا ہے یعنی بار بار تمنّا اٹھتی ہے محبوب کو پانے کی، مگر ناکام رہتی ہے۔ یہ مندر، مسجد کے پھیرے تمنّا کی تکمیل کی محض پناہ گاہیں ہیں۔ منزل نہیں ہیں۔

۲۴۲۔ ہوئی ہیں آب، شرم کوشش بے جا سے تدبیریں
عرق ریزِ تپش ہیں، موج کے مانند زنجیریں

مجھے اسیر کرنے کی سب تدبیریں ایسی بے جا ثابت ہوئیں کہ شرم سے پانی پانی ہو گئیں اور میری آزاد ہونے کی جد و جہد کی گرمی سے ایسا پسینہ آیا زنجیریں موجِ آب بن گئیں اور میں آزاد کا آزاد ہی رہا۔

۲۴۳۔ وحشی خو کردۂ نظّارہ ہے، حیرت، جسے
حلقۂ زنجیر، جز چشمِ تماشائی نہیں

عاشق کو اپنی پابستگی پر حیرت نہیں۔ اُس کی حیرت تو نظارہ کرنے کی مشتاق ہے اس لیے زنجیر کا ہر حلقہ نظارہ کرنے والی آنکھ بن کر رہ گیا ہے۔

۲۴۴۔ جو چاہیے نہیں وہ، مری قدر و منزلت
میں یوسفِ بہ قیمتِ اوّل خریدہ ہوں

میری قدر و منزلت وہ نہیں جو ہونی چاہیئے۔ میں بیش قیمت ہوں مگر یوسف کی طرح میری قیمت بہت کم لگائی گئی

۲۴۵۔ ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ
ہوں میں کلامِ نغز، ولے ناشنیدہ ہوں

کسی کے دل میں میرے سے لیے جگہ نہیں۔ کوئی میری قدر نہیں کرتا میں نادر کلام ہوں مگر اَن سنا ہوں۔ جب مجھے سنا ہی نہیں گیا تو کوئی میری قدر کیوں کر کرے گا۔

۲۴۶۔ اہلِ وَرَع کے حلقے میں ہر چند ہوں ذلیل
پر عاصیوں کے زمرے میں مَیں برگزیدہ ہوں

مَیں بے شک پرہیز گاروں کے حلقے میں ذلیل سمجھا گیا ہوں مگر میری برگزیدگی قائم ہے کیونکہ گنہگاروں کے حلقے میں معزز وممتاز تسلیم کیا جاتا ہوں۔

۲۴۷۔ پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ
ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

باؤلے کتے کا کاٹا ہوا جس طرح پانی سے ڈرتا ہے مَیں اُسی طرح آئینے سے ڈرتا ہوں کیونکہ آدمی کا کاٹا ہوا ہوں۔ آئینے میں جب اپنا بھی عکس دیکھتا ہوں تو وحشت ہوتی ہے کیونکہ مَیں بھی آدمی ہوں۔ آئینے کا پانی مشہور ہے۔

۲۴۸۔ اے نوا سازِ تماشا، سر بہ کف جلتا ہوں میں
یک طرف جلتا ہے دل، اور یک طرف جلتا ہوں میں

اے اپنی دید کا اہتمام کرنے والے! میں سر کو ہتھیلی پر لے کر جل رہا ہوں۔ ایک طرف میرا دل جل رہا ہے اور ایک طرف میں خود۔

۲۴۹۔ ہے تماشا گاہِ سوزِ تازہ، ہر یک عضوِ تن
جوں چراغانِ دِوالی صف بہ صف جلتا ہوں میں

میرے بدن کا انگ انگ ایک کے بعد ایک جل رہا ہے۔ ایک انگ کی آگ بجھتی ہے تو دوسرے انگ کو لگ جاتی ہے۔ اس طرح پورا بدن قطار اندر قطار جلتا ہے
جیسے دیوالی کے صف اندر صف چراغ۔

۲۵۰۔ ابر روتا ہے کہ بزمِ طرب آمادہ کرو
برق ہنستی ہے کہ فرصت کوئی دم ہے ہم کو

ابر برستا نہیں بلکہ رو رو کر ضد کرتا ہے کہ خوشی کی محفل آراستہ کرو مگر بجلی (چمک کر) اس خیال پر ہنستی ہے کہ فرصت تو محض ایک دم کی ہے۔ ایسے میں بزمِ طرب کا آراستہ کرنا چہ معنی؟

۲۵۱۔ اے دریغا! کہ نہیں طبعِ نزاکت ساماں
ورنہ کانٹے میں تُلے ہے سخنِ سنجیدہ

افسوس کہ کوئی نازک خیال شاعر ہی نہیں ورنہ عمدہ شاعری کو تو اب بھی سونا تولنے کے کانٹے میں تولا جاتا ہے۔ گویا شاعری اعلیٰ پایہ کی ہو تو قدر دانوں کی کمی نہیں

۲۵۲- کوئی آگاہ نہیں باطنِ ہم دیگر سے
ہے ہر اک فرد جہاں میں ورقِ ناخواندہ

ایک دوسرے کی دل کی بات کوئی نہیں جانتا۔ دنیا میں ہر آدمی اُس ورق کی طرح ہے جو پڑھا نہ گیا ہو۔

۲۵۳- ہے غنیمت کہ بأُمیّد گزر جائے گی عمر
نہ ملے داد مگر روزِ جزا ہے، تو سہی

ظالم کو سزا دینے کی استطاعت ہم میں نہیں مگر یہ امیّد تو ہے کہ قیامت کے روز انصاف ہو گا اور ظالم کو سزا ہو گی۔ چلیے، اس امیّد کے سہارے عمر تو کٹ جائے گی، انصاف ملے نہ ملے۔

۲۵۴- غیر سے، دیکھیے، کیا خوب نباہی اس نے
نہ سہی ہم سے، پر اس بُت میں وفا ہے تو سہی

باوفا دہی نہیں جو ہم سے وفا کرے۔ ہمارے محبوب نے ہم سے نہ سہی مگر غیر سے تو خوب نباہ کیا اس لیے یہ کہنا غلط ہو گا کہ اس میں وفا کا جوہر ہے ہی نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اُس نے ہم سے وفا نہ کی۔

۲۵۵- نقل کرتا ہوں اسے نامۂ اعمال میں مَیں
کچھ نہ کچھ روزِ ازل تم نے لکھا ہے تو سہی

جو بھی روزِ ازل میری تقدیر میں لکھ دیا گیا ہے، مَیں اُسے اپنے اعمال میں ڈھالتا رہتا ہوں۔ مَیں گناہ و ثواب کا کوئی فعل اپنی طرف سے روا نہیں رکھتا۔ گویا میں اپنے اعمال میں بے قصور ہوں کیونکہ وہ میرے بس میں ہیں ہی نہیں۔

۲۵۶- تم ہو بُت پھر تمہیں پندارِ خدائی کیوں ہے؟
تم خداوند ہی کہلاؤ، خدا اور سہی

مانا کہ تم حسین ہو محبوب ہو، بُت ہو مگر تم اپنے آپ کو خدا کیوں سمجھتے ہو۔ تمہیں خدائی کا غرور زیب نہیں دیتا کیونکہ تم خدا نہیں ہو۔ تم میرے خداوند، آقا، مالک ہی بنے رہو۔ خدا کا نام خدا کی ذات سے وابستہ رہنے دو۔

۲۵۷- کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں یارب؟
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

فردوس کی تمنا غلط نہیں مگر وہاں جگہ کم پڑے گی۔ کیوں نہ اس میں دوزخ کو بھی ملا لیں۔ سیر کے لیے میدان وسیع تر ہو جائے گا۔ گویا ہمارے لیے بہشت و دوزخ میں کوئی فرق نہیں۔ بس کشادگی ہونی چاہیے۔

۲۵۸- غالبؔ، زبسکہ سوکھ گئے چشم میں سرشک
آنسو کی بوند گوہرِ نایاب ہو گئی

اے غالب! آنکھوں میں آنسو ایسے سوکھ گئے ہیں کہ آنسو کا ایک ایک قطرہ اب انمول موتی کی طرح ہو گیا ہے۔

۲۵۹- تمثالِ جلوہ عرض کر، اے حُسن! کب تلک
آئینۂ خیال کو دیکھا کرے کوئی

اے محبوب! خود سامنے آ کر جلوہ دِکھا۔ تصوّر میں تیرا دیدار کوئی کب تک کرتا رہے۔

۲۶۰- بے چشمِ دل نہ کر ہوسِ سیرِ لالہ زار
یعنی یہ ہر ورق، ورقِ انتخاب ہے

اگر باطنی آنکھ کھلی ہوئی نہیں تو باغ کی سیر کی ہوس دل سے نکال دے کیونکہ باغ کے پتے پتے بوٹے بوٹے میں وہ کاریگری ہے کہ ہر پتا، ہر بوٹا ورقِ انتخاب کا درجہ رکھتا ہے۔

۲۶۱- نہ حیرت چشمِ ساقی کی نہ صحبت دورِ ساغر کی
مری محفل میں، غالب، گردشِ افلاک باقی ہے

میری قسمت میں نہ چشمِ ساقی کی حیرت ہے کہ اس سے کچھ مسرت حاصل ہو سکے نہ دورِ ساغر کی صحبت کہ اس سے کچھ سرور مل سکے۔ اے غالب! میری محفل میں تو گردشِ افلاک ہی ہے یعنی میرے حصے میں خوش بختی نہیں آنے کی۔

۲۶۲- حیرت حجابِ جلوہ و وحشت غبارِ راہ
پائے نظر بدامنِ صحرا نہ کھینچیے!

حیرت! دیدارِ محبوب میں پردے کی طرح حائل ہو جاتی ہے اور وحشت راستے کا غبار بن کر دیدارِ یار نہیں ہونے دیتی۔ اس لیے پائے نظر کو صحرا کے دامن پر نہ لے جائیے یعنی حیرت اور وحشت دونوں سے کنارہ کش ہو کر ہوش میں آئیے اور جلوۂ یار کا نظارہ کیجیے۔

۲۶۳- عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر
دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچیے

محبوب منت سماجت سے کہاں ماننے والا ہے۔ اس

صورت میں لازم آتا ہے کہ زور زبردستی سے اس کے دامن کو کھینچ کر اُسے راہ پر لایا جائے۔

۲۶۴۔ اسد، اٹھنا قیامت قامتوں کا وقتِ آرائش
لباسِ نظم میں بالیدنِ مضمونِ عالی ہے

اے اسد (غالب)! حسینوں کا سنگھار کرتے ہوئے ناز سے اٹھ کر کھڑے ہونا ایسا ہی ہے جیسے شعر میں کسی اعلیٰ اور ارفع مضمون کا پرورش پانا۔

۲۶۵۔ توڑ بیٹھے جبکہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گر برسا کرے

جب ہم نے جام و سبو ہی توڑ دیے یعنی مے کشی ہی ترک کر دی تو اب اگر آسمان سے شراب کی بارش بھی ہو تو ہوا کرے۔

۲۶۶۔ بعد از وداعِ یار، بہ خوں در تپیدہ ہیں
نقشِ قدم ہیں ہم، کفِ پائے نگار کے

محبوب کے چلے جانے کے بعد ہم خون میں لت پت تڑپ رہے ہیں۔ گویا ہم محبوب کے پاؤں کے سُرخ تلوے کے سُرخ نقشِ قدم ہیں۔

۲۶۷۔ تماشائے جہاں مفتِ نظر ہے
کہ یہ گلزارِ باغِ رہگزر ہے

جس طرح سبزہ گزر کھلے باغ کو ہر کوئی آتے جاتے بغیر کوئی قیمت چکائے دیکھ سکتا ہے۔ اُسی طرح دنیا کا نظارا بھی

مفت ہی کہا جاتا ہے۔ جو پیدا ہوتا ہے وہ راہِ عدم کا مسافر ہوتا ہے چنانچہ سیرِ جہاں اُسے مفت میں فراہم ہو جاتی ہے۔

۲۶۸۔ کمالِ حسن اگر موقوفِ اندازِ تغافل ہو
تکلّف برطرف تجھ سے تری تصویر بہتر ہے

اگر کمالِ حسن، اندازِ تغافل ہی پر موقوف ہے تو بلا تکلف کہوں گا کہ تجھ سے تیری تصویر بہتر ہے کہ وہ تغافل تو نہیں برتتی۔ اس سے کسی وقت بھی مخاطب ہوا جا سکتا ہے۔

۲۶۹۔ وہم طربِ ہستی، ایجادِ سیہ مستی
تسکیں دہِ صد محفل، یک ساغرِ خالی ہے

زندگی میں خوشی اک وہم ہے اور یہ غفلت کے نشے میں چُور ہونے کی وجہ سے ہے، ورنہ زندگی کی خوشی تو خالی ساغر ہے مگر اس وہم سے دنیا کی سینکڑوں محفلیں سرشار ہیں۔

۲۷۰۔ زندانِ تحمل ہیں، مہمانِ تغافل ہیں
بے فائدہ یاروں کو فرقِ غم و شادی ہے

ہم تحمل کے زنداں میں اسیر ہیں۔ ہم پر جو بلا بھی نازل ہوتی ہے اسے ہم چُپ چاپ برداشت کر لیتے ہیں گویا خدا کے تغافل کے مہمان ہیں اور وہ ہم سے غفلت برت رہا ہے۔ ایسی حالت میں لوگوں کا غم اور خوشی میں تمیز کرنا بے کار ہے۔

۲۷۱۔ جس طرف سے آئے ہیں آخر اُدھر ہی جائیں گے
مرگ سے وحشت نہ کر، راہِ عدم بیہودہ ہے

۔ جس طرف سے آئے ہیں آخر اُدھر ہی جائیں گے۔ موت سے کیا ڈرنا، راہِ عدم تو ہماری طے کی ہوئی ہے۔

۲۷۲۔ دیدہ خوں بار ہے مدّت سے، ولے آج ندیم
دل کے ٹکڑے بھی کئی خون کے شامل آئے

یوں تو فراقِ دوست میں آنکھ مدّت سے لہو ٹپکا رہی تھی مگر آج دوست کی یاد اس شدّت سے آئی کہ لہو کے ساتھ ٹوٹے ہوئے دل کے کئی ٹکڑے بھی ٹپک پڑے۔

۲۷۳۔ ان کو کیا علم کہ کشتی پہ مری کیا گزری
دوست جو ساتھ مرے تا لبِ ساحل آئے

جن دوستوں نے اپنی دوستی کنارے تک ہی نباہی اور وہیں سے الوداع کہہ کے پلٹ گئے، انھیں کیا معلوم کہ وسطِ دریا میں جا کر مری کشتی کو کیسی کیسی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔

۲۷۴۔ نہ حشر و نشر کا قائل، نہ کیش و ملّت کا
خدا کے واسطے ایسے کی پھر قسم کیا ہے

محبوب کو نہ قیامت تسلیم ہے، نہ وہ کسی مذہب کو مانتا ہے۔ پھر ایسے کی قسم کیا معنی رکھتی ہے؟ اس پر بھروسا کرنا فضول ہے۔

۲۷۵۔ بسکہ تھی فصلِ خزانِ چمنستانِ سخن
رنگِ شہرت نہ دیا تازہ خیالی نے مجھے

وہ سرسبز خطّہ جس پر شاعری کا چمن آباد تھا پژمردہ ہو چکا تھا، میں نے تازہ خیالوں سے اس پر پھر سے بہار لانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اس پژمردگی میں میرا رنگِ سخن شہرت نہ پا سکا۔